فہرست

ماہنامہ بتول لاہور
چمن
جون 2020ء

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	انفاق فی سبیل اللہ	ڈاکٹر میمونہ حمزہ	8
قولِ نبیؐ	دین کا علم	سید محمود حسن	14
خاص مضمون	میڈیا کو کتنا آزاد ہونا چاہیے	طارق جان	18
نوائے شوق	غزل	حبیب الرحمٰن	23
	غزل	عابدہ حسام الدین	23
حقیقت و افسانہ	رب کی شان	قانتہ رابعہ	24
	فیصلوں کے سراب	ام ایمان	29
	ویران کر گیا	ڈاکٹر میمونہ حمزہ	34
	ستارہ	عالیہ حمید	38
	منزل کے لیے دو گام چلوں	عشرت زاہد	42
	تجھے کیا خبر	بنت شیروانی	45
سیر و سیاحت	ماضی کے دریچوں سے	آمنہ راحت	47
یاد داشتیں	سعودی عرب میں ایک سال	پروفیسر خواجہ مسعود	57
پل صراط پر	بچوں کی تربیت کچھ خیالات	ڈاکٹر فائقہ اویس	61
غذا و صحت	کھجور کھاؤ یا خون کی بوتل لگواؤ	فریدہ خالد	65
محشرِ خیال	خواجہ مسعود، فریدہ خالد، شہلا کرن، طاہرہ طلعت		70
گوشۂ تسنیم	فتنہ اور صفائی	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	77

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام!

اس بار عید ویسے ہی غیر معمولی تھی۔ وبا کی وجہ سے رسم دنیا، موقع، دستور سبھی تقاضے بدل گئے تھے۔ بقول فیض احمد فیض:

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

دوری دستور محبت ہوئی، اور تکلف اپنائیت کی نشانی۔ گھر پہ مدعو نہ کرنا مہذب ہونے کی علامت بن گیا اور بلائے پر نہ جانا پڑھا لکھا ہونے کا ثبوت۔ چلیے یہ تو تدابیر کا حصہ ہے، کوئی سانحہ نہیں۔ مگر جن کے پیارے اس وبا کی نذر ہوئے اصل آزمائش تو ان کی تھی کہ اس حال میں عید کو عید کون کہے۔ اوپر سے عید سے دو روز قبل ہونے والے حادثے نے سمجھایا کہ اصل دکھ کی گھڑی کیا ہوتی ہے۔ سانحہ، محرومی اور غم کسے کہتے ہیں۔ چند لمحوں کی دوری پر منزل سامنے نظر آتی ہوئی مگر وہ مسافر کسی اور منزل کے تھے۔ اور کسی نے اچھا کہا کہ وہ تو منزل پہ پہنچ گئے، مسافر تو ہم ہیں۔ نگاہوں کے آگے سے وہ دلخراش مناظر نہیں ہٹتے۔ آخری لمحوں میں ان پہ کیا گزری ہوگی۔ تنگ جگہ میں فوری مدد بھی نہ پہنچ سکی اور جلتا ہوا طیارہ زندہ انسانوں کے لیے ایک بھٹی بن گیا۔

دیکھا ہے بہت دور تلک آگ کا منظر
کس دل سے کہوں اہلِ وطن عید مبارک
سڑکوں پہ لگی آگ میں جلتے ہوئے انساں
میں سوختہ دل، سوختہ تن، عید مبارک؟

صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ انسان ساری ترقی کے باوجود تقدیر کے آگے کیسے بے بس ہے، ایسے واقعات یہ بتانے کے لیے آتے ہیں۔ ایمان واحد سہارا ہے جو ایسے سانحات کا سامنا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔ تحقیقات ضروری ہیں، ہوتی رہیں گی مگر جانے والے واپس نہیں آئیں گے۔ پی آئی اے کی نئی انتظامیہ سے بہت امید تھی اور حالات بہتری کی طرف جانا شروع ہو گئے تھے۔ اب غیر جانبدار تحقیقات ہوں، ذمہ داروں کا تعین ہو تو آئندہ ایسے حادثات سے بچنے کا امکان ہو۔ اللہ غمزدہ دلوں پر مرہم رکھ دے اور جانے والوں کی اپنے ہاں بہترین میزبانی کرے آمین۔

لاک ڈاؤن میں عید کا وقفہ کرنا بہت مہلک ثابت ہوا ہے۔ وبا کے اعداد و شمار کئی گنا اوپر چلے گئے ہیں۔ کاروباری طبقے کے دباؤ پر پابندی نرم کی گئی مگر عوام کی گھٹی میں جو لاپروائی اور بدنظمی ہے، اس نے کسی اصول قانون کو نہیں دیکھا۔ عید کے کپڑے جوتے لینے کے لیے زندگیاں داؤ پر لگانا کہاں کی سمجھداری ہے۔ ڈاکٹر منتیں کرتے رہ گئے کہ لاک ڈاؤن نہ کھولا جائے بلکہ اور سخت کیا جائے مگر لوگوں نے کسی کی نہ سنی۔ نتیجہ یہ کہ اب ہسپتالوں میں رش پڑا ہے تو گنجائش ختم ہو گئی ہے۔ عوام الناس کے لیے یہ سادہ سی بات سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ جو جتنا محدود ہے اتنا محفوظ ہے اور اتنا ہی اوروں کو محفوظ رکھ رہا ہے۔ زندگی کے جتنے برس گزارے ہیں اتنی ہی عیدیں منائی ہیں اور پورے لوازمات کے ساتھ منائی ہیں۔ اب اگر ایک عید پہ نئے کپڑے نہ بنتے، دوست احباب میں نہ بیٹھتے تو ایسی کیا محرومی لاحق ہو جاتی! زندہ سلامت ہیں یہی کافی تھا۔ اب حال یہ ہے کہ لاک ڈاؤن کی بات ایک مذاق بن گئی ہے اور بیماروں کی تعداد چین سے بھی اوپر چلی گئی ہے جو سر توڑ کوششوں اور اپنے عوام کے تعاون کی وجہ سے وبا پر قابو پا چکا ہے۔ اللہ ہی ہے جو ہمارے حال پہ رحم فرمائے۔

کشمیر میں بھارت نے بدستور اندھی مچا رکھی ہے۔ اس ماہ دو کشمیری کمانڈروں کو شہید کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہاں غیر مسلم افراد کی غیر قانونی آبادکاری

بھی جاری ہے۔آج کی نام نہاد ترقی یافتہ دنیا جس لاقانونیت، ناانصافی اور بے ضمیری سے عبارت ہے، یہ اسی کے شاخسانے ہیں۔طاقت، اختیارات اور دولت کا اندھا کھیل ہے جس کے نرغے میں انسانیت سسک رہی ہے۔امریکہ میں ایک بے قصور سیاہ فام شہری کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت نے امریکی آزادیوں، مساواتوں، انصافوں، تہذیبوں وغیرہ وغیرہ کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا ہے۔اس واقعے کے نتیجے میں ٹرمپ کی نفرت اور تعصب پر مبنی پالیسیوں کے خلاف پکنے والا عوامی غضب کا لاوا ابل پڑا ہے۔ ہر ریاست میں عوام سراپا احتجاج امریکی پرچم نذر آتش کر رہے ہیں اور دولت اور طاقت کی علامات خصوصاً وائٹ ہاوس ان کے غم و غصے کا مرکز ہے۔جواباً حکومت فوج بلانے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔کیسا منظر ہوگا جب مجسمہ آزادی کے زیر سایہ نیویارک کی سڑکوں پر فوجی ٹینک گشت کریں گے اور ڈی سی میں ہر طرف کرفیو ہوگا۔امریکیوں کو محفوظ بنانے کے بہانے ساری دنیا میں آگ لگانے والے، اپنی ترقی اور تہذیب کے بل پہ دوسروں کو حقارت سے دیکھنے والے اب اپنے شہریوں کے ساتھ کیا کریں گے، پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

معروف قلم کار اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک آصف اسلم فرخی انتقال کر گئے۔مرحوم مدیر، مترجم، نقاد، محقق، استاد اور کئی کتب کے مصنف تھے۔ پیشہ طب کے باوجود ادب اور لسانیات میں اتنا کام کیا کہ صدارتی تمغہ امتیاز اور ادبی ایوارڈ کے مستحق ٹھہرے۔پاکستان میں ادبی میلوں کی روایت کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔طب، تعلیم، صحافت اور ادب ان تمام میدانوں میں ان کا کام پھیلا ہوا ہے۔خدا غریق رحمت کرے آمین۔

بتول اور نور اپریل مئی کا اکٹھا شمارہ جو ریلیں بند ہونے کے باعث زمینی راستے سے کراچی کو روانہ ہوا تھا، راستے میں روک لیا گیا۔وجہ یہ کہ جس ٹرک میں یہ رسالے سوار تھے، اسی میں کوئی ایسا الیکٹرونک سامان پایا گیا جس کی ڈیوٹی دینا بنتی تھی چنانچہ سندھ کے بارڈر پر روک کر ڈیوٹی کا مطالبہ ہوا۔ ملک کے اندر ایک صوبے سے دوسرے میں جانے کے لیے کسٹم ڈیوٹی کا یہ اصول کہاں سے آتا مگر شاید صوبائی حکومتوں کی آپس کی کھینچا تانی میں یہ صورتحال پیش آ گئی اور ہمارے رسالے ساتھ ناحق روک لیے گئے۔اب نہ ڈیوٹی ادا ہو رہی ہے نہ ٹرک روانہ ہونے کی نوبت آ رہی ہے۔اب دیکھیں پچھلا شمارہ کب ملتا ہے اور یہ جون کا شمارہ کب آپ کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے۔ناصر کاظمی کے اشعار کے ساتھ اجازت، بشرطِ زندگی اگلے ماہ تک۔

حسن کو دل میں چھپا کر دیکھو — دھیان کی شمع جلا کر دیکھو
کیا خبر کوئی دفینہ مل جائے — کوئی دیوار گرا کر دیکھو
فاختہ چپ ہے بڑی دیر سے کیوں — سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو
کیوں چمن چھوڑ دیا خوشبو نے — پھول کے پاس تو جا کر دیکھو
نہر کیوں رک گئی چلتے چلتے — کوئی پتھر ہی گرا کر دیکھو
دل میں بے تاب ہیں کیا کیا منظر — کبھی اس شہر میں آ کر دیکھو
ان اندھیروں میں کرن ہے کوئی — شب زدو آنکھ اٹھا کر دیکھو

دعا گو

صائمہ اسما

اعزاز

بتول کی مضمون نگار تزئین حسن نے ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے ایم اے صحافت کی ڈگری مکمل کر لی ہے۔اس کامیابی پر ہم ان کو دلی مبارکباد دیتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ یہ علم ان کے لیے نافع ثابت ہو آمین۔

D/Arshad hussain/batool/batool2017/ octo2017

سید محمود حسن

دین کا علم

• رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اسلام'' آغاز میں اجنبی تھا اور عنقریب اپنے آغاز ہی کی طرح اجنبیت کے دور میں داخل ہو جائے گا پس (اسلام پر عمل کرنے اور اس کی دعوت دینے والے) اجنبیوں کی زندگی قابل رشک ہے (مسلم۔ترمذی)

عربی میں ''غریب'' اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو اپنے وطن سے دور اور غیر معروف ہو۔ مکہ میں جب حضورؐ نے ''لا الہٰ الا اللہ'' کی تحریک کا آغاز کیا اور چند پاک روحوں نے اسے قبول کیا تو اسلام کے یہ چند پروانے پوری عرب آبادی میں نامانوس اور انوکھے تھے تحریک اقامت دین شروع شروع میں کچھ ایسی لگتی ہے جیسے ایک معاشرہ میں ان دیکھی اور اجنبی چیز نے اپنے وجود کا اعلان کیا ہو اور وہ معاشرہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ اور کہہ رہا ہو کہ آپ یہاں کیسے اور کیوں؟

آنحضرتؐ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ عروج کے بعد پھر اسلام پر ''غربت'' (انوکھے، نامانوس اور اجنبی کے معنی میں) کا دور آئے گا اسلام اصلی اور جامع شکل میں نگاہوں کے اوجھل ہو جائے گا لوگ اسلام کے داعیوں اور جان نثاروں کو عجیب و غریب سمجھیں گے کیونکہ مروج نظاموں اور مقبول عام نظریات کی مارکیٹ میں ایسے نظام زندگی کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسلامی نظام برپا کرنے والوں کو الحاد اور بے دینی کے دور میں ہر قسم کے جانی اور مالی خطرات کو انگیز کرنا پڑے۔ ان حالات میں اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کو بارگاہِ نبوت سے یہ خوشخبری ملی ہے کہ وہ بڑے سعادت مند اور خوش بخت ہیں اور قابل رشک ہے ان کا یہ مثالی کردار کہ وہ دنیا میں حق کی شہادت دیتے ہیں، بگاڑ اور فساد کی اصلاح کے لیے جہاد کرتے ہیں اور آخرت میں بہت بڑے انعام کے مستحق بنتے ہیں۔

جس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ

''اے نبی! اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ''۔ (الشعرا آیت ۲۱۴)

تو رسول اللہؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے گروہ قریش! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچا لو میں تم سے اللہ کے عذاب کو نہیں ٹال سکتا۔ اے عبد مناف کی اولاد! میں تم سے اللہ کے عذاب کو نہیں ہٹا سکتا اے عباس بن عبدالمطلب میں تم کو اللہ کے عذاب سے نجات نہیں دلا سکتا اے صفیہ! رسول اللہ کی پھوپھی میں تم سے اللہ کے عذاب کو نہیں ہٹا سکتا۔ اے فاطمہ رسول اللہؐ کی بیٹی میرے مال میں سے جو کچھ چاہے مانگ سکتی ہے میں تم سے بھی اللہ کے عذاب کو نہیں ہٹا سکتا (بخاری)۔

آخرت میں دوزخ کے پہاڑ جیسے شعلوں سے بچ نکلنے کی صرف ایک ہی راہ ہے وہ یہ کہ ''انسان، اللہ تعالیٰ کے دین (اسلام) کی پیروی کرے اور لوگوں کو اس کی دعوت دے''۔ جو اس راہ پر چلے وہ اللہ کا وفادار بندہ ہے، وہ انعام پائے گا اور آخرت کی سزا سے بچ جائے گا اور جو اس راہ پر چلنے سے انکار کر دے، روڑے اٹکائے یا اس کے خلاف سازش کرے وہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں جائے گا چاہے وہ پیغمبر کا رشتہ دار ہو یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے صاف طور پر فرما دیا تھا کہ تم اللہ پر ایمان لا کر اور اس کی اطاعت کر کے آگ سے بچنے کی کوشش کرو..... ورنہ مجھ سے خاندانی اور نسلی نسبت تمہاری نجات کی ضامن نہیں ہے بلکہ آپؐ نے اپنی قابل احترام پھوپھی اور لخت جگر بیٹی سے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف فرما دیا: کہ میرے مال میں سے جو کچھ لینا ہو، مجھے اس سے انکار نہیں، رشتہ قرابت کا حق ادا کرنے کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں۔ لیکن میرے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ گمراہی اور نافرمانی کی سزا سے میں تمہیں چھڑا لوں۔

اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دین کی دعوت کا آغاز اپنے قریب ترین اعزہ سے ہونا چاہیے۔ نادان ہے وہ شخص جو اقامت دین کی جدوجہد میں اپنے کنبہ اور خاندان کو نظر انداز کرتا ہے۔ صلہ رحمی کا تقاضا بھی ہے کہ انسان اپنے رشتہ داروں کو اس خیر اور بھلائی سے محروم نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ بڑے رنج اور دکھ کی بات ہے کہ بہت سے خادمان دین اپنے بال بچوں، بھائیوں اور قریب کے رشتہ داروں پر دعوت کا کام کرنے میں تساہل برتتے ہیں۔

● حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا دین، خلوص اور خیر خواہی ہے ہم نے عرض کیا کس کے لیے خلوص اور خیر خواہی ؟ آپؐ نے فرمایا

(۱) اللہ کے لیے۔

(۲) اس کی کتاب کے لیے۔

(۳) اور اس کے رسولؐ کے لیے۔

(۴) اور مسلمانوں کے لیڈروں اور حکمرانوں کے لیے۔

(۵) عام مسلمانوں کے لیے۔ (مسلم)

دین کا تعلق زندگی کے ہر گوشے سے ہے اور ملک کے ہر فرد سے ہے چاہے وہ عالم ہو یا جاہل، غریب ہو یا خوشحال، حاکم ہو یا کسی گروہ کا لیڈر اور رہنما۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے لیے مخلصانہ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا مالک، آقا اور حاکم تسلیم کیا جائے اور مانا جائے کہ وہ کسی کی مدد اور مداخلت کے بغیر پوری کائنات کا نظام سنبھالے ہوئے ہے وہ ہر نقص، کمزوری اور عیب سے پاک ہے، آدمی صرف اسی ایک معبود حقیقی کا بندہ بن کر رہے اس کی عبادت میں کسی کو ساجھی اور شریک نہ ٹھہرائے اور اس کی نعمتوں کا اعتراف کرے۔

(۲) اس کی کتاب کے لیے خیر خواہی'' نام ہے اس عقیدہ کا کہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں نازل کی ہیں وہ برحق ہیں ان میں سے آخری کتاب قرآن ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے اس کی تلاوت کی جائے، اس کا علم حاصل کیا جائے اس کا احترام کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ قرآن نے بتایا ہے اسے خلوص دل سے اپنا لیا جائے۔

(۳) اس کے رسول کے لیے حصول اور خیر خواہی یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں آنجنابؐ کی پیروی کی جائے اور آپؐ کی رہنمائی پر مکمل اعتماد کیا جائے اس کے علاوہ حضورؐ نے دین اسلام پر عمل کرنے اور دنیا میں اسے غالب کرنے کا جو کام کیا ہے ہم اسے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں ہم سب آپؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اور اسے قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں:

(۴) مسلمانوں کے حکمرانوں سے خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی حفاظت اور سالمیت کے لیے ان سے بھرپور تعاون کیا جائے معروف اور نیکی میں ان کی اطاعت کی جائے اگر وہ غلطیوں اور گناہوں میں مبتلا ہو رہے ہوں تو ان پر دلسوزی کے ساتھ تنقید کی جائے اور ان کی خوشامد کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

(۵) عام مسلمانوں کے لیے خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو پر حملہ نہ کیا جائے وہ اگر بیمار پڑ جائیں تو ان کی مزاج پرسی اور تیمارداری کی جائے اگر وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو ان کی مدد کی جائے۔

● رسول اللہؐ نے فرمایا بہترین کلام، اللہ کی کتاب ہے اور سب سے اچھا طریقہ وہ ہے جسے محمدؐ نے پیش کیا ہے۔ (مسلم)

یعنی قرآن اور سنت سے زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ ثابت ہے۔ اسے اختیار کرو۔ ان کے دائرہ سے جو کچھ باہر ہے غلط ہے اور گمراہی ہے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کی راہ وہی ٹھیک ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے اور سیدنا محمدؐ نے اپنی تئیس سالہ زندگی میں جس کے نقوش ثبت کیے ہیں نادان ہے وہ شخص جو زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کو چھوڑ کر، دنیا کے لیڈروں اور مفکروں کا طواف کرتا پھرتا ہے کیونکہ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین سیرت، محمدؐ کی سیرت ہے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کے اصول بتائے ہیں جن کو انفرادی

اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے سے انسانی تمدن نہایت متوازن ہو جاتا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ نبیؐ نے زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ اختیار فرمایا وہ نہایت معتدل، معقول اور فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ان دو چیزوں سے رہنمائی لینا چاہیے۔ ایک قرآن اور دوسری سنت۔

سیاست و معاشرت، معیشت، اخلاق اور تمدن میں کتاب اور سنت سے رہنمائی حاصل نہ کرنا سخت ترین گمراہی ہے زندگی کے ہر معاملہ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کے متعلق کیا حکم دیا ہے اور رسول اللہؐ سے اس سلسلہ میں کیا رہنمائی ملتی ہے؟

جب اللہ کا حکم اور اس کے رسولؐ کا طریقہ ایک راہ متعین کر دے تو پھر مسلمان کا کام یہ ہے کہ مطمئن ہو کر اس راہ پر چل پڑے اور ادھر اُدھر نہ بھٹکے۔

- نبیؐ نے فرمایا، تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔ (بخاری)

دین کی اقامت کا کام جن بنیادوں پر قائم ہوتا ہے ان میں سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ قرآن کے علم کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ جو لوگ قرآن مجید ناظرہ یا حفظ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں یا اس کا ترجمہ اور تفسیر سیکھتے اور سکھاتے ہیں یا لکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور صاحب فضیلت ہیں اس آسمان کے نیچے خالق کائنات کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ صرف قرآن سے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے نبیؐ ۲۳ برس تک اس کتاب کی رہنمائی سے اسلامی نظام کی تشکیل فرماتے رہے بالآخر یہ دین مکمل ہو گیا کتاب کی تنزیل اختتام کو پہنچی اور صاحبِ قرآن اپنے کام سے فارغ ہو کر اپنے رب سے جا ملے ایسی عظیم الشان کتاب کا مرتبہ اور مقام بہت بلند ہے یہ اللہ رب العالمین کا کلام ہے اور اسلامی نظام حیات کا دستور ہے آخری رسولؐ پر نازل ہوا ہے اور قیامت تک کے لیے مشعل راہ ہے۔

- رسول اللہؐ نے فرمایا (قیامت کے دن) قرآن کا عالم، فرمانبردار، بزرگ فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو رسولوں کو اللہ کے پیغامات پہنچانے پر مامور تھے اور جو شخص قرآن کو اٹک اٹک کر بڑی مشقت سے پڑھے اس کو دہرا ثواب ملے گا (ترمذی)۔

''ماہر بالقرآن'' (جس کا ترجمہ ہم نے عالم قرآن سے کیا ہے) کے معنی ہیں:

(۱) قرآن مجید کو بلا تکلف پڑھنے والا جو ادب اور صحت کے ساتھ اس کی تلاوت پر قادر ہو۔

(۲) قرآن مجید کا حافظ، جس نے اعلیٰ درجہ کا حافظہ پایا ہو، قرآن کی تلاوت اور قرأت اس کے لیے آسان ہو۔

(۳) قرآن کا عالم، جو اسے سمجھ کر پڑھتا ہو، اس میں غور و تدبر کرتا ہو اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔

حدیث کے الفاظ میں یہ سارے مفہوم شامل ہیں بشرطیکہ ''ماہر بالقرآن'' کی زندگی، قرآنی تعلیمات کے مخالف نہ ہو ورنہ قرآن کی تلاوت اور اس کے علم کا اس شخص کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو عملاً قرآن کے احکام اور ہدایات کا تمسخر اڑاتا ہو اور اس کی زندگی میں اللہ سے بغاوت پائی جاتی ہو۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن کی تلاوت اور حفظ کا ثواب، اور قرآن کے ترجمہ و تفسیر کے پڑھنے پڑھانے کا فائدہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ آدمی قرآن حکیم پر عمل کرنے کی کوشش کرے اور اس سے ہدایت طلب کرنے کا خواہش مند ہو۔

''قرآن کا عالم، بزرگ فرشتوں کے ساتھ ہوگا'' کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن قرآن کا عالم باعمل معززین میں ہوگا اور اسے اللہ کے خاص مقربین کے ساتھ جگہ ملے گی قرآن کی تلاوت کرنے پر اللہ اجر دیتا ہے۔ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں مثلاً الف، لام، میم (الٓمٓ) تین حرف ہیں ان کی تلاوت پر اللہ تعالیٰ تیس نیکیاں عطا فرماتا ہے لیکن جس کی زبان میں لکنت ہو اور وہ آسانی سے تلاوت نہ کر سکتا ہو بلکہ تلاوت کے وقت الفاظ ادا کرتے ہوئے اسے سخت مشقت برداشت کرنی پڑ رہی ہو اسے دہرا ثواب ملے گا۔

تلاوت کے علاوہ مشقت برداشت کرنے پر بھی اسے اجر ملے گا یہ بات اس کی حوصلہ افزائی کرنے اور اسے قرآن کی ترغیب دینے کی غرض

سے فرمائی گئی ہے۔ تاکہ جو شخص زبان میں لکنت کی وجہ سے قرآن کی تلاوت بآسانی نہ کرسکتا ہو وہ یہ محسوس نہ کرے کہ اس فطری کمزوری کی وجہ سے وہ اجر وثواب سے محروم رہے گا۔

ورنہ ظاہر بات ہے کہ زبان میں لکنت کی وجہ سے جو شخص صحیح طریقہ سے قرآن کی تلاوت نہیں کرسکتا وہ ثواب اور مرتبہ میں اس عالم قرآن سے کیسے افضل ہوسکتا ہے جو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قرآن میں غور وتدبر کرنے، اس کی تعلیمات کو پھیلانے اور اس پر عمل کرنے میں صرف کرچکا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ''عالم قرآن'' نہ صرف یہ کہ عام تلاوت کرنے والوں سے بہتر ہے بلکہ اللہ کی نگاہ میں وہ سب سے زیادہ باعزت اور مقرب بھی ہے۔

● رسول اللہؐ نے فرمایا جو شخص دین کا علم حاصل کرنے کے لیے سفر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کردیتا ہے جب اہل ایمان اللہ کے کسی گھر میں قرآن کی تلاوت کرنے اور اس کے پڑھنے پڑھانے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں تو ان پر ''سکینۃ'' نازل ہوتی ہے رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے مقرب فرشتوں سے ان کا ذکر کرتا ہے اور جس شخص کو اس کے عمل نے موخر کردیا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھائے گا۔ (مسلم، ترمذی)

جنت کی راہ آسان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل وکرم سے صحیح راہ پر چلنے اور اپنے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عنایت فرماتے ہیں''۔ اور یہی جنت کی راہ ہے اس انعام کا وعدہ اس شخص کے لیے ہے جو شہرت عزت وجاہ اور حصول دولت کے ارادے سے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو شخص بھی اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے اٹھے اسے اس دین کا علم لازماً حاصل ہونا چاہیے۔ آخر اسے معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ جس دین کا علمبردار ہے وہ ہے کیا؟

علم دین کی روح، قرآن مجید ہے۔ اجتماعی طور پر قرآن کی تلاوت کرنے اور اس کے معانی ومطالب پر غور وفکر کرنے والوں کا اللہ کے ہاں بہت بڑا مرتبہ ہے جو لوگ قرآن حکیم کے اصول اور احکام کی تشریح کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور اس کے رموز واسرار کی نقاب کشائی کے لیے علمی بحثیں کرتے ہیں اور اس کی تفسیر کے لیے ایک دوسرے سے تبادلۂ افکار کرتے ہیں۔

(۱) ان کے دلوں پر قرار اور سکون نازل ہوتا ہے، نفسانی تاریکی دور ہوجاتی ہے۔

(۲) اللہ کی رحمت انہیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

(۳) اللہ کے فرشتے جو قرآن کی تلاوت کرنے اور اسے پڑھنے والوں کو دیکھنے کی خاطر زمین کا چپہ چپہ چھان مارتے ہیں آکر ان کو اپنے پروں میں ڈھانپ لیتے ہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ اپنے مقرب فرشوں سے فرماتے ہیں دیکھو! میری فلاں مسجد میں انسانوں کا ایک گروہ میری کتاب کی تلاوت کررہا ہے اور اس کے علوم پر غور وتدبر کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کررہا ہے اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت کرنے اور اس کے پڑھنے پڑھانے کا یہ انعام صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جو خلوص قلب سے اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور طلب ہدایت کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو قرآن کریم پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں وہ یقیناً اس ''انعام'' کے مستحق نہیں ہیں جس کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے چاہے وہ بہت اونچے خاندان کے چشم وچراغ ہوں۔

ہمارے دور کے سادات کی اکثریت جو نہ تو قرآن پر عمل کرتی ہے اور نہ رسول اللہؐ کی اتباع کرتی ہے، اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ صرف حضورؐ سے نسبی تعلق کی بنا پر لازماً جنت میں جائیں گے اور ان پر دوزخ کی آگ حرام ہے حالانکہ اس حدیث کا آخری جملہ اس کے برعکس یہ حقیقت واضح کررہا ہے کہ کوئی شخص (چاہے وہ سید ہی کیوں نہ ہو) ایمان اور عمل صالح کے بغیر نہ تو دوزخ کی آگ سے بچ سکتا ہے اور نہ جنت میں جاسکتا ہے۔

اس حدیث سے مسجد میں اجتماعی طور پر قرآن مجید کی تلاوت کرنے کا ثبوت ملتا ہے درسگاہوں اور صاف ستھرے مکانوں میں بھی اجتماعی تلاوت کی جاسکتی ہے۔

(جاری ہے) ☆

قول نبیؐ

دوسرا حصہ

سید محمود حسن

دین کا علم

• رسول اللہؐ نے فرمایا جس نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو ایک ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی اس سورج کی روشنی سے زیادہ ہوگی جو تمہارے دنیا کے گھر میں ہو۔ (بالفرض اگر سورج اپنی روشنی اور خوبصورتی کے ساتھ تمہارے گھر میں ہو تو وہ کس قدر پرکشش، جاذب نگاہ اور حسین لگے گا یہ تو اس کے ماں باپ کو جزا ملے گی لیکن تم خود اندازہ کرلو قیامت کے دن اس آدمی کو اللہ تعالیٰ کیا انعام دے گا جس نے قرآن پڑھ کر اس پر عمل کیا؟ (ابوداؤد)۔

یعنی قرآن پر عمل کرنے والے کے والدین کو سورج سے زیادہ خوبصورت تاج پہنایا جائے گا لیکن قرآن کو سمجھ کر پڑھنے اور اس پر عمل کرنے والے کو خود جو عزت اور بادشاہت ملے گی تمہارا تنگ ذہن اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

• رسول اللہؐ نے فرمایا اللہ فرماتے ہیں جو شخص قرآن میں مشغول ہونے کی وجہ سے نہ تو میرا ذکر کرسکے اور نہ وہ مجھ سے اپنی ضروریات کے لیے سوال کرسکے تو میں اسے سوال کرنے والوں سے بڑھ کر عطا کروں گا اللہ کا کلام (قرآن) ساری کائنات کے کلام سے برتر اور اعلیٰ ہے جیسے اللہ اپنی ساری خلقت سے برتر اور افضل ہے (ترمذی)

قرآن میں مشغول ہونے کے معنی ہیں قرآن کی تلاوت کرنا، اس کے معانی میں غور وفکر کرنا، اس کے ترجمہ وتفسیر کا پڑھنا پڑھانا، لکھنا اور پھیلانا۔

جو شخص قرآن میں مشغول ہو، اللہ کی نگاہ میں اس کا مرتبہ ذکر کرنے والوں اور دعا کرنے والوں سے زیادہ ہے اس لیے خادم قرآن کو اللہ تعالیٰ دوسروں سے بڑھ کر عنایت فرماتا ہے۔

• نبیؐ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے (اے امت مسلمہ) تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک ایسے (خطرناک) عذاب میں مبتلا کردے گا کہ اس سے نجات پانے کے لیے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو گے مگر وہ تمہاری دعاؤں کو قبول نہیں کرے گا (ترمذی)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ''امت مسلمہ'' کے ذمہ یہ کام سپرد کیا ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نیکیوں کو غالب کرے اور برائیوں کو روکے۔ اگر وہ اپنے اس مقصد زندگی کو فراموش کردے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اسے ایسی سزا دیتے ہیں جسے دعاؤں سے بھی نہیں ٹالا جاسکتا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بالکل ترک کردینے کی سزا یہ ہے کہ یہ امت، غیر مسلم اقوام کی محکوم بن جائے گی یا مسلم قوم کے ظالم اور بدکار افراد ان پر حکومت کریں گے یہ صورت حال اللہ ذوالجلال کے غضب اور غصہ کی مظہر ہے۔ جسے دعاؤں سے بھی دور نہیں کیا جاسکتا۔

اقامتِ دین کے رہنما اصول چار ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ آدمی جس دین کو زمین پر قائم کرنے کے لیے اٹھے اسے سب سے پہلے اپنے جسم کے ظاہر اور باطن پر قائم کرے وہ شخص معاشرے کو اسلامی نہیں بنا سکتا جس کا اپنا جسم مسلم نہ ہو۔ جو شخص لوگوں کو نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اٹھے وہ سب سے پہلے ان نیکیوں پر خود عمل کرے جس کی دعوت اس نے دوسروں کو دینی ہے اور ان برے کاموں سے دستبردار ہوجائے جن سے اس نے دوسروں کو روکنا ہے۔ جس شخص کی زندگی اس کی دعوت پر گواہ نہ ہو، اس کے قول اور عمل میں ہم آہنگی نہ ہو وہ نہ صرف یہ کہ دین کی کمزوری اور بدنامی کا موجب بنتا ہے بلکہ وہ اس جرم کی سزا آخرت میں بھی بھگتے گا۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ دین کی دعوت کا آغاز اپنے گھر سے کرنا چاہیے۔ آدمی، بیوی بچوں اور گھر کے دوسرے افراد کو اسلام کی تعلیم دے اور ان کی اصلاح کرے اور انہیں مسلم (اللہ کا فرمانبردار) بنائے۔

یا ایھا الذین امنو اقو انفسکم و اھلیکم ناراً (التحریم آیت ۶)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو آگ سے بچالو۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو دین کی تعلیمات سے آگاہ کرنا، داعی الی اللہ، انہیں خلوص اور محبت سے دین حق پر عمل کرنے کی دعوت دے (ملاحظہ ہو حدیث نمبر ۱۶۸) دین کی دعوت دینے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ انہیں ایک دو بار جمع کر کے اسلامی احکام سنا دے اور بس، بلکہ اس مقصد کے لیے ان سے مسلسل اور بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن یاد رہے کہ دعوت میں تاثیر داعی کی عملی زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ اپنے پڑوسیوں پر دین کی دعوت کا کام کرے اور ان سے مسلسل ربط رکھے۔

ایک بدوی نے مسجد میں پیشاب کیا تو صحابہؓ اسے زدوکوب کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا اسے پیشاب کرنے سے نہ روکو پھر آپؐ نے پانی کا ڈول منگوا کر پیشاب پر بہا دیا (بخاری، مسلم)۔

آنجنابؐ نے اس موقع پر جو طرز عمل اختیار فرمایا اس سے دعوت و تبلیغ کی حکمت پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ آپؐ نے پہلا کام تو یہ کیا کہ مشتعل افراد کو بدوی پر ہاتھ اٹھانے سے روک دیا دوسرا کام یہ کیا کہ اسے اطمینان سے پیشاب کرنے دیا گیا رحمت کے پیکر نے گوارا نہ کیا کہ پیشاب کا عمل درمیان میں رکوا کر ایک انسان کو بیمار کر دیا جائے۔ آپؐ نے بدوی کو اس غلطی پر ڈانٹ ڈپٹ نہ کی اور نہ صحابہ کرام کو اجازت دی کہ وہ اسے برا بھلا کہیں یا اسے زدوکوب کریں۔ اس فاش غلطی اور مسجد نبوی کی بے ادبی پر بدوی کو سزا دینے کے بجائے اسے بعد میں نرمی سے سمجھا دیا۔

● رسول اللہؐ نے فرمایا نیک کام کرنے میں جلد بازی کرو ان فتنوں سے پہلے جو کالی رات کی پیہم اور لگا تار تاریکیوں کی طرح آنے والے ہیں۔ صبح کا مومن شام کو کافر ہو جائے گا (یا فرمایا) شام کو مومن صبح ہوتے ہی کفر اختیار کر لے گا اور دنیا کے چند ٹکوں میں اپنا دین بیچ ڈالے گا (مسلم، ترمذی)۔

اس حدیث میں جن فتنوں سے خبردار کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) ایمان باللہ پر قائم رہنا دشوار ہوگا، انقلاب ایک دن میں اپنا کرشمہ دکھا دے گا دین فروشی معمول بن جائے گی مسلمان کا زوال اس حد تک پہنچ جائے گا کہ وہ صرف ''مادی فائدوں'' کی خاطر بہت جلد اپنے دین کو داؤ پر لگا دیں گے یہاں تک کہ معاشی ترقی کی خاطر وہ اس چیز کو حرام قرار دیں گے جسے اللہ نے حلال کیا ہے اور اس چیز کو حلال قرار دیں گے جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ یعنی لین دین اور معاملات کے غیر اسلامی طریقوں کو اپنا لیں گے۔

(۲) وہ باہمی عداوت میں مبتلا ہو جائیں گے دینی امور میں اختلاف کی وجہ سے ملت اسلامیہ میں شدید تفرقہ بازی رونما ہوگی اور جاہلی عصبیتوں کی وجہ سے ان کے درمیان لڑائی، جھگڑا ہوتا رہے گا ہر گروہ، دوسرے گروہ کے خون اور مال کو اپنے لیے حلال قرار دے گا قتل اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگا۔

(۳) اقتدار پر ظالم اور فاسق و فاجر حکمران مسلط ہوں گے وہ مسلمانوں کا خون بہائیں گے اور ناحق ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیں گے لوگ ان کی حمایت کریں گے علما، سو ان کی لوٹ مار اور ظلم و تشدد کے جواز کا فتویٰ دیں گے۔

حضورؐ نے جن فتنوں کی خبر دی تھی ہمارے دور میں ان کا سیلاب آ گیا ہے اب ایمان کے علمبرداروں کا فرض ہے کہ وہ بگڑے ہوئے مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کے لیے سر توڑ کوشش کریں۔ اللہ کا کلمہ بلند کرنے والوں کو ان اہل ایمان سے سابقہ ہے جو ڈانواں ڈول ہونے کے علاوہ دین کے معاملہ میں کمزور ہیں۔ دنیاوی فائدوں کی خاطر اپنا دین چھوڑ دینے پر آمادہ ہیں۔

● حضرت اسامہؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے رسولؐ کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی لایا جائے گا اور اسے آگ میں ڈالا جائے گا۔ دوزخ میں اس کے پیٹ کی آنتیں (دبر سے) بہت جلد باہر نکل آئیں گی وہ ان کے اردگرد اس طرح چکر لگائے گا جیسے گدھا

چکی کے گرد چکر لگاتا ہے دوزخی اس کے گرد جمع ہو کر پوچھیں گے اے فلان! یہ تیرا کیا حال ہے؟ کیا تو (دنیا میں) ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے نہیں روکتا تھا؟ وہ جواب میں کہے گا (ہاں یہ سچ ہے) میں تمہیں نیکی کا حکم دیتا تھا لیکن اس پر عمل نہ کرتا تھا میں تمہیں تو برائی سے روکتا تھا لیکن خود اس برائی میں مبتلا تھا اس لیے یہ سزا بھگت رہا ہوں (بخاری، مسلم)۔

''معروف'' سے مراد اسلام کے وہ احکام اور اامر ہیں جن پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور منکر سے مراد وہ گناہ اور برائیاں ہیں جن سے دور رہنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے یہ حدیث ایک لمحہ فکریہ ہے ان لوگوں کے لیے جو دین کی دعوت اور تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ علما اور دینی جماعتوں کے افراد کو چاہیے کہ وہ اس ''معروف'' پر خود بھی عمل کریں جس کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور اس ''منکر'' سے اجتناب کریں جس سے لوگوں کو روکتے ہیں ورنہ قیامت کے دن وہ اس سزا کے مستحق ہوں گے جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

☆.....☆.....☆

خاص مضمون

میڈیا کو کتنا آزاد ہونا چاہیے؟

طارق جان
ترجمہ: محب الحق صاحبزادہ

حکومت اور میڈیا کے تعلق اور آزادیِ رائے سے متعلق چند مباحث☆

ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اطلاعاتی ماحول خود ہماری قومی سلامتی کے ماحول کی توسیع ہے۔ دونوں کا ملاپ ہی تخریب کے خلاف ہمارا دفاعی مورچہ ہے۔ اس مورچہ میں ذرا سا شگاف بھی سلامتی کے مسائل پیدا کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ اطلاعاتی ماحول میں اسی وقت چھید پڑ جاتے ہیں جب اس کے الیکٹرانک اور اشاعتی میڈیا کے اجزا قومی ایجنڈا ایک طرف رکھ کر اپنا ہی مرتب کردہ نصاب لے بیٹھتے ہوں۔ ابتدا ہر اُس چیز کی تحقیر و تخفیف سے شروع ہوتی ہے جو قوم کی نگاہوں میں اس کی جغرافیائی اور سیاسی سلامتی، حب الوطنی اور بنیادی اقدار کے حوالے سے قدر منزلت اور تقدس کی حامل ہو۔ جس کے نتیجے میں بالآخر معاشرے کا اجتماعی وجود بکھرنے لگتا ہے۔ تضادات اور تصادم روزمرہ کا معمول بن جاتے ہیں۔ یہی بات ایک اور ڈھنگ سے بھی کہی جاسکتی ہے۔ اگر ذرائع ابلاغ کو اجازت ہو کہ وہ بنیادی مسائل پر قائم شدہ اجماع کو توڑ کر کوئی نیا آہنگ سامنے لائیں تاکہ قومی شعور کی شکست و ریخت ہو اور وسوسوں اور ذہنی اختلال کو راہ دیں، یا قوم کے ذہنی تحفظات کو تھپکیاں دے کر اغیار کے لیے نرم و گزار بنائیں، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو بغیر لڑے ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ کرلیا جائے۔ ذرائع ابلاغ کے مختلف گوشوں پر ایسے افراد کا قبضہ جنہیں کسی نہ کسی وجہ سے مملکت سے ایک طرح کا بیر ہو تباہی کا مظہر ہوتا ہے۔ ایسے لوگ صحافتی اور فنونی آزادیوں کے نام پر مملکت کی جڑیں ایک ایک کر کے کترتے رہتے ہیں، اور یہ ایک بھیانک اور ڈراؤنی جنگ ہے۔

یہ بتانے سمجھنے کے لیے زیادہ سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں کہ کرداری فنون اور صحافتی حلقے جو آزادیاں مانگتے ہیں ان کی افادیت اسی وقت تک ہوسکتی ہے جب تک وہ اس معاشرے اور اس کی روایات سے ہم آہنگ رہیں، جس میں انہیں کام کی اجازت ملی ہوتی ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ یہ دونوں حلقے مملکت کے اختیار و اقتدار کے مراکز کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ مقتدر حلقوں کی طرف سے اغماض کی وجہ سے ابلاغی اداروں کے منتظمین اور اُن کے ملازم صحافی، ایک ایسی من موجی صورت حال کو پیدا کر دیتے ہیں جس میں کوئی ضابطہ رُو بہ کار نہیں رہتا۔ پھر جو مرضی لکھا جائے اور دکھایا جائے۔ ہر دو صورتوں کی حد پرواز خیال سے بھی پرے لگتی ہے۔

اس صورت حال میں کوئی بھی تحریر یا بیان جو دستوری سرچشمے سے روشنی حاصل نہ کرے، پاکستان کے لیے تباہی کا باعث ہوسکتا ہے۔ یہ محض خیالی اندازہ نہیں بلکہ زندگی کی حقیقت ہے جس سے اقتدار کے ایوان آنکھیں چراتے ہیں۔ ہر گزرنے والا دن ہمیں قائل کر رہا ہے کہ آزادی کا غلط استعمال کر کے ہمارے ذرائع ابلاغ الا ماشاء اللہ ادائیگی فرض سے مجرمانہ غفلت برتتے ہیں۔ یہ مملکت پاکستان کے خلاف دراندازی ہے اور عوام الناس کی اقدار و روایات کی نفی ہے۔ باقی جرائم کی بہ نسبت ابلاغی ذرائع کا جرم بدتر اور قبیح ہوتا ہے کیونکہ یہ اس پاکستان کے خلاف ایک مسلسل جنگ ہے جس نے ان اداروں کے سر پر سایہ کیا ہوا ہے۔ ہمارے ملکی میڈیا کا ایک حصہ جن قومی تصورات کی جھاگ اڑاتا رہتا ہے ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

- قومی ریاست بُری ہے۔ چنانچہ حب الوطنی بھی بری چیز ہے۔
- مسلم قومیت کا تصور محدود ہے اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔
- پاکستان دنیا میں سب سے بری ایک ناکام ریاست ہے۔
- پاکستان کا اسلامی تشخص (برائے نام ہی سہی) فرقہ وارانہ اور خوف زدہ کرنے والا ہے۔
- پاکستان کا کوئی مستقبل نہیں۔

☆ سیکولرازم مباحث اور مغالطے۔ منشورات

- انڈیا کے ساتھ کنفیڈریشن (قائم ہونی چاہیے)
- سارک ماقبل آزادی کے برطانوی ہند کا شکلہ (یا سہارا دینے والی پیچر) ہے۔
- مسلمانوں کی اجتماعی شناخت ازمنۂ وسطیٰ کی سی اور بری ہے۔ اسے یا تو جنوبی ایشیائی ہونا چاہیے ورنہ پھر کچھ بھی نہیں۔
- تاریخ کی تدوین نو ہو۔ پاکستانی اصلاً ہندوستانی ہیں۔
- کشمیری پاکستان میں شامل نہ ہوں کہ یہ ان کے لیے اچھا نہ ہوگا۔
- اس کے علاوہ انگریزی میڈیا، جس پر لادینوں کا غلبہ ہے، مسلمانوں سے متنفر احزاب کا قلعہ بند مورچہ ہے جہاں سے پاکستانی عوام کے سماجی اور اخلاقی اقدار پر مسلسل گولہ باری ہوتی رہتی ہے۔ ایک نظر ان کے منتخب سُر اور مطالب بھی دیکھیے۔
- مسلمان ہونا اچھی شناخت نہیں۔
- انسانی کردار کی ضابطہ ہندی، جو اصلاً معاشرے کی تعمیر و تکمیل ہے، قابل ملامت ہے۔
- بے قید اور غیر ذمہ دار صنفی تعلق ''شہوت و عشق کا لطف'' ''لا ہوتی لمحات'' سے عبارت ہے۔
- بعض سیکولر نظریاتی ہم نوا اتنے دلیر ہو ہو گئے ہیں کہ وہ اغیار کو دعوت دے رہے ہیں کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں اور تنصیبات کو بین الاقوامی کنٹرول میں لے لیا جائے اور انہیں عام معائنہ کے لیے کھول دیا جائے۔

اگرچہ انگریزی پڑھنے والے لوگ معاشرے میں بہت قلیل التعداد ہیں لیکن یہی طبقہ سب سے زیادہ موثر حلقہ ہے۔ یعنی مسلح افواج، سول ملازمین، کارپوریٹ انتظامیہ، عدلیہ اور تعلیمی مراکز کے متعلقین وغیرہ۔ میڈیا کی طرف سے روزانہ جو کچھ کانوں میں انڈیلا جا رہا ہے کیا اس کے بعد یہ لوگ قوم اور مملکت کے حق میں صحیح فیصلہ کرنے کے قابل رہیں گے؟ کیا یہ دستور پاکستان کے آرٹیکل ۲۔الف میں بیان شدہ مقاصد کے دفاع میں کھڑے رہ سکیں گے؟ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس متاثرہ حلقہ کا ردعمل ایسے حالات میں کیا ہوگا۔

یہ سوال کہ صحافت کتنی آزادی ہونی چاہیے بذات خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی بے لگام آزادی میں کچھ ایسے مضر پہلو موجود ہیں جو تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ وہ مضر پہلو کیا ہے، اُنہیں جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ میڈیا کن لوگوں کے تصرف میں ہے؟

ہمارے ہاں میڈیا میں پانچ قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں:

- سینہ کوبے، جو ہر وقت اپنے اوپر کر بلا طاری رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ قوم بھی ان کی سینہ کوبی کے عمل میں شامل ہو جائے۔
- قنوطیے یا یاس زدہ، جنہیں چاروں طرف مایوسی کے کھنڈرات اور دُکھ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔
- تشکیک پسند یا سنکی جو ہر بات کو جھٹکتے ہیں اور معاشرہ کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کر کے منفی سوچ پھیلاتے ہیں۔
- برخود غلط، جو مقام اولیٰ پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں اور اپنا حق سمجھتے ہیں کہ عوام کو ان اخلاقی قدروں سے محروم کر دیں، جو اُن کے تاریخی تشخص کو موجودہ زمانہ میں ممکن بناتے ہیں، اور اس طرح ایک اجنبی معاشرتی ایجنڈے کو ان پر مسلط کر دیں۔
- رجائیت پسند، جو تنقید کرنے سے گریز نہیں کرتے اور دُور سرنگ کے پار اُنہیں روشنی بھی نظر آتی ہے۔

ان کے علاوہ میڈیا مالکان کا طبقہ ہے، جنہیں الا ماشاءاللہ، دولت اور طاقت کے حصول سے غرض ہے۔ اُن کے اخبارات میں کیا شائع ہو رہا ہے یا ٹی وی پر کیا آ رہا ہے، یہ شاید ان کی دلچسپی کے زمرے میں نہیں آتا۔

ان میں سے پہلے چار بظاہر نفسیاتی عوارض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن ایسا ہے نہیں، سینہ کوبی ہو یا یاس زدگی، سنکی پن ہو یا تشکیک پسندی یا پھر برخود غلط ذہنیت، یہ سب شعوری طور پر اختیار کیے ہوئے راستے ہیں۔ دیوانہ بکار خود ہوشیار کے مصداق، ان کی دیوانگی دانستہ مسلط کردہ ہے۔ وہ

آزادی رائے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وطن عزیز کی اساسیات کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نفسیاتی جنگ کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ایک دشمن ملک دوسرے کے خلاف جسے وہ زیر کرنا چاہتا ہے: یاس، احساس محرومی، تشکیک، سنکی پن اپنے وجود سے نفرت، شکستگی، عدم خود اعتمادی اور مستقبل کے بارے میں مایوسی پھیلائے اور معاشرے کے مختلف گروہوں میں منافقت، تنگ دلی اور عصبیت کو ہوا دے، تاکہ ایک ہی وطن کے باسی ایک دوسرے سے محاذ آرائی کے راستے پر چل پڑیں اور اس طرح ملکی وحدت کو منتظر کر دیں۔ پھر طے شدہ اساسی اُمور کو بار بار چھیڑیں، تاکہ جس چیز نے انہیں باندھا ہوا تھا وہ متنازع ہو کر بے اثر ہو جائے۔ اس کے لیے ظاہر ہے میڈیا ہی کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سیکولر لابی کے جو لوگ یہ کام کر رہے ہیں، وہ جانے پہچانے ہیں۔

جہاں تک حکومت اور میڈیا کے نہ ختم ہونے والے تنازع کا تعلق ہے، اس سے قطع نظر ہمارے ہاں میڈیا کو اسی وقت پابند کیا جاتا ہے جب حکومت وقت کے اعصاب اس کی تنقید کے سامنے جواب دینے لگتے ہیں۔ بس اسی وقت حکومت کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ''میڈیا اپنی حدود کا احترام کرے'' اور ایسے ہی وقت پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ''میڈیا غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہا ہے''۔

یہ رویہ اپنی جگہ، لیکن بہر طور حقیقت یہی ہے کہ طاقتور میڈیا اور وہ بھی اتنا وسعت پذیر اور جس کی غیر مشروط آزادی اور توانائی پر امریکہ اور یورپ حیران ہیں، حکومتوں کے لیے سنگین مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ اچھی صورتِ حال نہیں لیکن وجہ ظاہر ہے، جب برسر اقتدار لوگ یہ کہیں کہ ''ہمارے اوپر تنقید مت کرو''۔ اور میڈیا یہ کہے ''ہمیں حق ہے کہ ہم جو کہیں اور جیسے کریں، آپ ہمیں روک نہیں سکتے'' یا یہ کہ ''میڈیا نے آزادی چھین کر لی ہے''۔ تو پھر یہ بُعد المشرقین کا مسئلہ ہے جس پر پل نہیں بنایا جا سکتا۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں مسخرہ پن کچھ زیادہ ہی ہے۔ ہر کوئی اپنے لیے اختیارات سے متجاوز حق مانگتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ غیر مشروط آزادی اپنے لیے مانگتا ہے اور پابندی دوسروں کے لیے۔ مثلاً، کئی عشروں سے برسر اقتدار لوگ میڈیا کے لیے ضابطہ اخلاق کی بات کرتے ہیں، مگر کوئی خاکہ جس پر میڈیا عمل کر سکے پیش نہیں کرتے۔ جب معاملہ میڈیا پر چھوڑا جائے کہ وہ خود کسی ضابطہ، اخلاق کا پابند ہو تو وہاں سے بھی پیش رفت نہیں ہو پاتی۔

لیکن یہ مسئلہ اتنا بھی پیچیدہ نہیں کہ اس کا حل نہ ڈھونڈا جا سکے، البتہ چند شرائط ہیں جن کو دونوں فریقین کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

پہلے قدم پر حکومت کو چاہیے کہ وہ میڈیا کا حق تسلیم کرے کہ وہ اس کے غلط طرز عمل کو عوام کے سامنے پیش کرے گا۔

حکومت کا میڈیا کی تنقید پر مبالغہ آمیز حد تک حساس ہونا بذات خود ایک بیماری کی علامت ہے، جسے دور کرنا نہ صرف میڈیا کا فرض ہے بلکہ عوام کا حق بھی ہے۔ سمجھدار حکومتیں جو عوام کے سامنے اپنے آپ کو جو اب دہ محسوس کرتی ہیں، وہ نہ صرف صحیح مشورہ کی طالب ہوتی ہیں بلکہ اپنے طرز عمل کے ہر وقت احتساب کی بھی متمنی ہوتی ہیں تاکہ خرابی کا سد باب کیا جا سکے۔ اسی طرح وہ عدلیہ کو بھی اپنا معاون سمجھتی ہیں، میڈیا اور عدلیہ کے اشتراک سے اچھی حکمرانی ممکن بنائی جاتی ہے۔

حکومت (حکومتوں) اور میڈیا کے تنازع میں ایک اور افسوس ناک پہلو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ حکومت اپنی کارکردگی پر تنقید کے بارے میں تو شمشیر برہنہ ہے، لیکن جب میڈیا کا ایک حصہ خود پاکستان کے وجود پر تیغ زنی کرتا ہے اور بار بار کوشش کرتا ہے کہ برطانوی ہند کی تقسیم کو غلط ثابت کرے، تو حکومت کو کوئی پروا نہیں ہوتی، حالانکہ قوانین موجود ہیں جن کے تحت ایسے اخبارات اور ٹی وی چینلز کو سزا دی جا سکتی ہے۔ یہ پہلو اس لیے بھی افسوس ناک ہے کہ حکومت کا اولین دستوری فریضہ مملکت کی حفاظت اور استحکام ہے۔

میڈیا کے رویے میں بھی خامیاں ہیں، جن کی وجہ کچھ مفروضے ہیں اور کچھ تلخ حقیقتیں، مثلاً میڈیا کو یہ خناس ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ آزادی غیر مشروط ہوتی ہے، ایسی آزادی اس کرہ ارض پر کہیں بھی نہیں۔ کیونکہ ایسی آزادی جس کا مدار نہ ہو بالآخر افراتفری کی طرف لے جاتی ہے، جس سے معاشرے اور قومیں کمزور ہوتی ہیں۔ اس طرح میڈیا کو اس پہلو پر بھی توجہ دینی چاہیے کہ اگر اُن کے حقوق ہیں تو اس ریاست اور مسلمان معاشرہ کے بھی کچھ حقوق ہیں جس کے وسائل سے وہ مستفید ہوتے ہیں۔

میڈیا اور حکمرانوں کے اس تنازع میں ایک تیسرا فریق بھی ہے اور وہ پاکستانی عوام ہیں، جو فی الحال خاموش ہیں، مگر اندر سے پریشان ہیں۔ اخبارات کے بعض کالم اور ٹی وی کے بعض ٹاک شو اور ڈرامے ان کے ذہن میں کئی سوالات اٹھاتے ہیں، جن کا جواب انہیں نہیں مل رہا۔ وہ سوچتے ہیں یہ کیسے لکھنے والے اور باتیں کرنے والے لوگ ہیں اور کس ملک کے باسی ہیں کہ اپنے ملک کے وجود کو، اس کی مسلم شناخت کو، اس کی اخلاقی قدروں کو للکارتے پھرتے ہیں؟ یہ کون مالکان اور کارندے ہیں جو انہیں ایسی گفتگو کا موقع فراہم کرتے ہیں؟

بات کھول کر بیان کی جائے تو پوچھا جا سکتا ہے کہ میڈیا کو کس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ پاکستان کو بطور ریاست مطعون کرے، یا یہ کہے کہ پاکستان کی تو ضرورت ہی نہیں تھی اور یہ کہ پاکستان کی تخلیق مذہبی تنگ نظری کی مرہون منت ہے، یا یہ کہ پاکستان سامراجی سازش کا نتیجہ ہے، وگرنہ ہندو اور مسلمان ایک قوم تھے۔ ایسا کُفر سیکولر حضرات ہی تخلیق کر سکتے ہیں۔

اسی طرح میڈیا کو کس نے یہ حق دیا ہے کہ وہ نظریہ پاکستان کو اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ قرار دے، اور اسی طرح وہ اس تاریخی اجماع کو توڑنے کی کوشش کرے، جسے خود پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے قرار دادِ مقاصد کا نام دیا اور بعد میں اسے ذوالفقار علی بھٹو نے 1973 کے دستور میں رہنما اُصول کا مقام دیا، یعنی ایسے اصول جن سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سمت کا تعین ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ تمام دستوری موضوعات جو قومی اجماع کے نتیجہ میں 1947ء کے عشرے میں طے ہو گئے تھے، انہیں بار بار ٹاک شوز اور پرنٹ میڈیا میں زیر بحث لانا، اُن پر طعن اور طنز و تشنیع کرنا، دنیا کے کس جمہوری اور دستوری قواعد میں درست سمجھا جاتا ہے۔

یہ حق نہ دستور پاکستان میڈیا کو دیتا ہے اور نہ معاشرتی و سیاسی تقاضے۔ میڈیا کا یہ کہنا کہ ''یہ ہمارا بنیادی حق ہے'' ایک کمزور موقف ہے۔ کیونکہ کوئی بنیادی حق اپنے اطلاق اور عمل پذیری میں ایک مخصوص متن رکھتا ہے، جس سے کاٹ کر اس کا اظہار ایک مہمل حرکت بن جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کوئی معاشرہ اسی وقت بنیادی حقوق دیتا ہے جب اسے یقین ہو کہ ایسا حق اس کی بقا، سلامتی، استحکام اور انصاف قائم رکھنے میں معاون ہوگا۔

لیکن اگر یہی حق معاشرے میں انتشار پھیلانے، اس کی قوت مدافعت کو کمزور کرنے، اور اسے احساس کمتری اور مایوسی و شکست خوردگی میں مبتلا کرنے کے لیے استعمال ہو، تو پھر یہ سند جواز کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی سیدھی سادی مثال حق احترام زندگی ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہری کو تحفظ ذات دے، لیکن اگر وہی شہری کسی کو قتل کرتا ہے یا ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھاتا ہے، تو وہی ریاست اسے خود مارنے پر تل جاتی ہے۔ یہی حال آزادی رائے کا بھی ہے۔

ظاہر ہے ایسی صورت حال جو متضاد مفادات کے ٹکراؤ کے باعث پیدا ہوئی ہو، اس سے عہدہ برا ہونے کا ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے کہ موضوعی موقف کے بجائے معروضیت کو پیش نظر رکھا جائے۔ کیونکہ معروضیت سے ہی ہمیں وہ میزان مل سکتی ہے، جس سے ہم انفرادی اور ادارتی رویوں کو صحیح یا غلط کہہ سکتے ہیں۔

یہ معروضیت اسی صورت میں ممکن ہو گی جب ہم اسے دستور پاکستان سے لیں گے۔ دستور پاکستان میں شق ۲ الف، ۲۲۷، ۳۱، اور ۱۴۰ اس ضمن میں بڑی بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، جن سے معاشرے اور ریاست کے مختلف شعبہ جات اور اداروں میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے، اور اس طرح انتشار اور تباہی سے بچا جا سکتا ہے۔ ان شقوں کے مطابق پاکستانی ریاست پر لازم ہے کہ وہ مسلمان شہریوں کے لیے ایسا ماحول پیدا کرے کہ وہ اپنی زندگیاں اسلامی قدروں کے مطابق گزاریں۔ لیکن ہمارے ہاں ایک طبقے کی جانب سے اسلامی نظام پر تبرّیٰ بھیجا جاتا ہے اور لادین نظریات کی ترویج کھلم کھلا کی جاتی ہے۔ بہت سی علاقائی اور سیاسی پارٹیوں نے سیکولرازم اور لسانیت پر مبنی سیاست شروع کی ہوئی ہے۔

دستور پاکستان کی یہ شقیں ہمیں بتاتی ہیں کہ مسلمان معاشرے میں فحاشی کی حوصلہ شکنی کی جائے گی، ریاست بذریعہ تعلیم، میڈیا اور قانون ملک میں وحدت پیدا کرے، لیکن یہاں لسانی سیکولر گروہوں نے ملک کو لسانیت کے نام پر تقسیم کا کام شروع کیا ہوا ہے اور اب تو ایک دوسرے کو دشنام طرازی اور زبان اور علاقے کے نام پر مارا بھی جا رہا ہے۔

آئین پاکستان یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ خارجہ پالیسی کا رجحان مسلمان

ممالک کی طرف ہونا چاہیے اور ان سے برادرانہ تعلقات اور اسلامی بنیادوں پر اتحاد اور وحدت ہونی چاہیے، مگر ہمارے ہاں میڈیا نے الا ماشاء اللہ امن کے نام پر مہم شروع کی ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کو انڈیا کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔ ایسے تضادات میں کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس ضمن میں ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ آزادی رائے جو کسی آئینی اور اخلاقی دائرہ میں ہو وہ نعمت خداوندی ہے۔ اس لیے اس کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر ایک مضبوط ناقابل تنسیخ دستاویز ہو، جس سے ہر کوئی فرد اور ادارہ رجوع کر کے ہدایت لے سکے، اور جسے کوئی حکومت یا عدالت نہ منسوخ کر سکے اور ان اُس پر پابندیاں لگا سکے۔

میڈیا کے لیے ممکنہ ضابطہ اخلاق

پریس ہمارا وہ اہم ترین ادارہ ہے، جو اہم قومی مسائل پر عوامی رائے کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر اس کا انداز ملک دشمنی کا آئینہ دار اور سنگی ہو اور یہ ایک مسلسل مہم چلائے رکھے، جس سے ہماری پاکستانی قومیت پر ابہام کے سائے گہرے ہوتے رہیں، تو اس سے لوگوں کا ایک اپنے ملک اور اس کے مستقبل پر اعتماد کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اس سے ہماری قومیت کی یہ عجیب تصویر بنتی ہے اور جمہوریت کا ہمارا یہ نرالا شعور بھی سامنے آتا ہے کہ ہم خواہش تو رکھتے ہیں کہ ہم ایک مہذب معاشرے کے طور پر زندہ رہیں، لیکن آزادئ اظہار کے نام پر افراتفری کا طوفان بھی برپا کیے رکھتے ہیں۔ میڈیا، خواہ اخباری ہو یا الیکٹرانک، لازماً ایک ضابطہ اخلاق کا حامل ہونا چاہیے، جس کی پوری سختی سے پیروی ہو۔ مملکت کے مفاد کا تقاضا ہے کہ ذیل کا مجوزہ ضابطہ اخلاق اختیار کیا جائے۔ اس ضابطہ اخلاق کی بنیاد پاکستان کے ضابطہ فوجداری کی شق ۱۲۳۔اے اور دستور پاکستان کی شق ۲۔الف، ۳۱، ۴۰ اور ۲۲۷ ہونی چاہیے۔ ان کی روشنی میں جو ضابطہ اخلاق بنے گا۔ وہ درج ذیل پہلوؤں کا احاطہ کرے گا۔

- میڈیا کسی اخبار، رسالے یا ٹی وی چینل کو ایسے کسی بیان یا تحریر کی اشاعت کی اجازت نہیں دے گا، جو پاکستان کی تخلیق یا اس کے جغرافیہ اور اقتدار اعلیٰ کے منافی ہو۔
- میڈیا پاکستان کو ہندوستان میں ضم ہونے یا اس سے کسی طرح کے الحاق کے تصور کو پھیلانے میں کوئی مدد نہیں دے گا۔ پریس نہ تو خود یہ سوال اٹھائے گا، نہ ایسے کسی مباحثے کی حوصلہ افزائی کرے گا جس میں پاکستان کے مقصد تخلیق کو محل اعتراض بنایا گیا ہو اور اس کی بقا پر بہتان طرازی کی گئی ہو۔
- میڈیا کوئی ایسی چیز شائع نہیں کرے گا جو کسی فرد، یا پوری قوم یا معاشرے کسی گروہ کو اس طرح متاثر کرتا ہو کہ جس سے پاکستان کی سلامتی پر حرف گیری ہوتی ہو یا اس کا اقتدار اعلیٰ خطرے میں پڑتا ہو۔
- میڈیا کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ یا بلاواسطہ تعاون ایسے گروہوں کو فراہم نہیں کرے گا، جو نفرت اور نسلی اور لسانی عصبیت کی سیاست کرتے ہوئے وفاق سے علیحدگی کی بات کرتے ہوں، اور جس سے مسلم شعور و آگہی متصادم ہوں۔
- میڈیا فحش اشتہارات اور تفریحی پروگراموں میں لچر پن اور عریانی سے گریز کرے گا۔ ہندوستانی فلمیں اور ڈرامے نہیں دکھائے گا۔
- میڈیا دستور میں واضح طور پر بیان شدہ اسلامی نظریے کو مختلف فیہ بنانے یا اس کی تخریب کے درپے نہیں ہوگا۔
- میڈیا نہ تو کوئی ایسی بات لکھے گا، نہ نسلی اور فرقہ وارانہ احساسات کی حوصلہ افزائی یا ایسے گروہ کی حمایت کرے گا، جن کا عمل پاکستانی قومیت کے خلاف نفرت کی سیاست کی گواہی دیتے ہوں۔
- میڈیا اپنی رپورٹنگ میں اس امر کا اہتمام کرے گا کہ اس میں توازن ہو، نا انصافی نہ ہو۔ میڈیا کو یہ بھی ممکن بنانا ہوگا کہ رپورٹر خبر کو سیکولرزم، لسانیت یا گروہی تعصّبات کا فریم نہیں دے گا۔

میڈیا ہر اس شخص یا ادارے کو اپنے صفحات میں جگہ دے گا، جس کا خیال ہو کہ اس کی ایذا رسانی ہوئی ہے یا اس کی ایسی غلط تصویر کشی ہوئی ہے جس کی اصلاح وہ سمجھتا ہو کہ ضروری ہے۔

یہ ایک سہل قابل عمل ضابطہ اخلاق ہے، کیونکہ اس کا خمیر قومی دستور سے اٹھایا گیا ہے۔ اگر اس قسم کے ضابطے کی پابندی نہ کی گئی تو خدشہ ہے کہ غیر منضبط آزادی رائے ملک میں انتشار اور اعتماد کا بحران پیدا کر دے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عوام اپنے نظریے اور اقدار کو خطرے میں دیکھ کر ''انتہا پسندی'' کی راہ اختیار کر لیں، اور ملک خدانخواستہ خانہ جنگی میں دھنستا چلا جائے۔☆

غزل

بے لوث محبت کی گھنی چھاؤں میں آؤ
کیا شہر میں رکھا ہے مرے گاؤں میں آؤ

اے دھوپ کے مارو مجھے دیوار بنالو
سایوں کی طرح تم نہ مرے پاؤں میں آؤ

جانا ہے تو یادوں کے سبھی نقش مٹادو
خوابوں میں خیالوں میں نہ آشاؤں میں آؤ

گر تم یہ سمجھتے ہو بجا ہے تو بجا ہے
اغیار کی صورت میں شناساؤں میں آؤ

فطرت سے جو ملنا ہو تو شہروں سے نکل کر
جنگل میں بیابانوں میں صحراؤں میں آؤ

کچھ اور مہک جائیں گے یادوں کے مناظر
گھنگھور برستی ہوئی برکھاؤں میں آؤ

حبیب الرحمٰن

غزل

ہر شخص گمان کر رہا ہے
مشکل سے وہی گذر رہا ہے

شب جیسے جیسے اجڑ رہی ہے
دن رفتہ رفتہ نکھر رہا ہے

بیٹھا ہوں جب سے بزمِ غم میں
پھر قلبِ حزیں سنور رہا ہے

ہاں وحشتِ دل ہی زندگی ہے
یوں روح میں کیف اتر رہا ہے

دل مثلِ گُل کبھی کھلا تھا
اب مثلِ گُل ہی بکھر رہا ہے

پھر انتظارِ فصلِ گل ہے
پھر انقلاب ابھر رہا ہے

عابدہ حسام الدین

ماہنامہ جہانِ نو لاہور جون 2020ء

غزل

کہتا ہے ہر اک بجھتا دیا اور ہی کچھ ہے
اب کے جو چلی ہے وہ ہوا اور ہی کچھ ہے

کب میری زمیں پر نہیں ٹوٹیں ہیں بلائیں
اس بار مگر میرے خدا اور ہی کچھ ہے

دیتی ہے درِ عرش پہ فوراً ہی وہ دستک
جو دل سے نکلتی ہے دعا اور ہی کچھ ہے

ہر داغِ معاصی کو مٹا دے گی، جو میری
ان آنکھوں میں چھائی ہے گھٹا اور ہی کچھ ہے

پھل کھانے پہ اتری مری خلعت، یا بتادے
یہ اُس کی سزا تھی یا خطا اور ہی کچھ ہے

ہیں سارے پرانے وہی کردار، یا تیری
دیکھوں تو کہانی میں نیا اور ہی کچھ ہے

میں بھی ذرا دیکھوں تری ریکھاؤں کے اندر
ہے نام بھی میرا یا لکھا اور ہی کچھ ہے

جب جب بھی کہا رحم، ہوئیں رحمتیں، لیکن
اس بار حبیبؔ حکمِ خدا اور ہی کچھ ہے

حبیب الرحمٰن

قانتہ رابعہ

رب کی شان

آخر ایک نامور صحافی کی بیوی تھی۔ جب سے یہ کرونا نام کی بلا چمٹی تھی اٹھتے بیٹھتے مخصوص فقرے سنائی دیتے۔ موبائل پکڑو تو میسجز، آڈیوز اور اللہ ماری لمبی لمبی پوسٹ جنہیں پڑھنے کے لیے سارا دن چاہیے ہوتا..... ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں لو تو ایسے ایسے دل دہلا دینے والے فقرے، تجزیے اور بیانات کہ عافیہ کا دل چاہتا اس کا گلا گھونٹ دے بلکہ اس سے تو جذبات کی شدت کا پتہ نہیں چلتا تھا اس کی گچی مروڑ دے تاکہ دل میں ٹھنڈ پڑے۔ اور تو اور میاں عاطف محمود شوہر نامدار جسے نصف بہتر بھی کہا جاتا ہے وہ آفس سے آتا تو کانوں میں سیسہ انڈیلتا۔

کام والی ماسیوں کو جواب دو..... سوشل ڈسٹینس اختیار کرو..... ہلاکتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ موت کتے کی موت سر پر منڈلا رہی ہے۔

کرونا سے مرنا خوفناک نہیں کرونا سے مرنے کے بعد عبرت ہی عبرت ہے..... ارے جس میت کا منہ نہ دیکھا جا سکے اس کے میت کی چارپائی کو کندھا نہ دیا جا سکے۔ اپنے ہاتھوں سے قبر میں نہ ڈالا جا سکے ارے جس کی میت پر گھر والوں کو پرسا نہ دیا جا سکے۔ اس کے گلے لگنے کی بجائے چھ فٹ دور سے بچوں کی طرح ٹاٹا بائے بائے کے انداز میں ہاتھ ہلا کہ کہہ دیا جائے۔ بہت افسوس ہوا..... عافیہ بیگم عقل..... عقل ایک کو کرونا کا مطلب پچاس اموات اور جو باقی بچ گئے ان کو قید تنہائی میں مار دو..... اور جو ٹیسٹوں کے بہانے رقم اینٹھی جائے گی وہ ہزار کا ہندسہ عبور کر کے لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے..... عافیہ موت کو ماسی نہ کہو۔

عافیہ بختوں ماری نے قید تنہائی لے لی۔ اس نے باہر جانا تو درکنار گھر سے باہر جھانکنا بھی چھوڑ دیا۔ اس نے سوشل میڈیا کے علاوہ اپنے شوہر کی ہر ہدایت پر عمل کیا مگر نہ مانا تو کام والی ماسیوں کو جبری رخصت پر بھیجنے کا حکم۔

عاطف اپنے شاہی حکم کی تلوار لیے سر پر ہی سوار رہا تا آنکہ اس نے کام والے بچے کو جواب دے دیا۔ کہنے کو دس سالہ خدا بخش دیہاتی بچہ تھا لیکن دیہاتیوں کے نام پر دھبہ۔

انتہائی درجہ کا چلتر چالباز مگر کام میں پھرتیلا اندر باہر کے سو کام وہی کرتا..... اسے بھیجنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا..... سو اس نے فرمانبردار بیوی کی طرح اطاعت مجازی خدا میں مار ہی لی..... اور کیا کرتی سیدھی جہنم میں جاتی؟

نماز روزہ تو بیچاری کا ویسے ہی ڈنگ ٹپاؤ قسم کا تھا رکعت تین پڑھتی تو سجدے دو کرتی اور سجدے چار کرتی تو رکوع پانچ ہو جاتے۔ اب لے دے کے شوہر کی اطاعت ہی رہ جاتی تھی وہ نہ کرتی تو ساری زندگی ضمیر کی چوٹ سہتی..... بچے کو بھیجتے ہوئے اس کا دل غمزدہ تھا اس کے مانگنے سے پہلے ہی عافیہ نے اگلے ماہ کی تنخواہ بھی پیشگی دے دی تاکہ واپسی کی آس امید باقی رہے..... ڈرتو اسے زیبن سے تھا..... زیبن اس کی ملازمہ پلس فائیو ان ون..... خود تو عافیہ کو ہزار شرعی عذر لاحق تھے بڑا بیٹا سوا تین سال کا بیٹی دو سال کی اور اب بیس دن کا بیٹا..... بچے کہنے کو چھٹانک بھر کے مگر ماں کا پیٹ چاک کروا کے چیر پھاڑ کروانے کے بعد دنیا میں تشریف لائے..... موسم اچھا ہی تھا اس نے لگے ہاتھوں ساتوں دن عقیقے کے گوشت کی تقسیم کے بعد ختنے بھی کروا دیے۔ بڑے بیٹے کی مرتبہ وہ شروع میں ختنے نہ کروا سکی تھی ویسے بھی پہلے بچے کی دفعہ تو ماں کا دل ہولتا ہی رہتا ہے..... چند دن تک چند دن تک کہتے کہتے جب بچہ سوا سال کا ہوا تو ماں کا سات سمندر پار سے ڈانٹ بھرا لیکچر سن کے ختنے کروائے..... اور اُف وہ دن کوئی بھولنے والے تھے۔ سات دن اور چھ

راتیں بچے کے ساتھ وہ روتی رہی۔اب جب لگے ہاتھوں اس سنت کو بروقت ادا کرنے کا فریضہ سرانجام دیا تو سر منڈاتے ہی اولے پڑنے کے مصداق ختنے کرواتے ہی کرونا درپیش.....ہائے ہائے یہ تو کوئی مر کے بھی نہ کہے کہ زبین چھٹی لے لے.....بندہ بشر ہونے کے ناطے اگر وہ چھٹی کر ہی لیتی تو اسے محسوس ہوتا زبین کے بغیر وہ ادھوری ہے.....اور پھر مرے کو مارے شاہ مدار!

ساس اللہ کو پیاری ہوئیں سسر دمہ کے مریض اور اونچا سنتے۔جتنا اونچا سنتے اس سے کہیں زیادہ اونچا بولتے۔سسرال کے نام پر دن کو.....بستر توڑنے والا صحافی شوہر اور سارا دن رولا رپا ڈالنے والے سسر۔بس سسرال میں اس کا یہی سرمایہ تھا۔اور میکے میں بہن بھائی بھانجے بھتیجے ماں باپ سب تھے مگر کوسوں دور۔بقول کسے کوا ہڈی نہ لا سکے۔ایسے میں زبین ہی اس کی ملازمہ تھی اور وہی اس کی بہن بھانجی نند سب کچھ۔کام وہ جی لگا کے کرتی محنت اس کی گھٹی میں پڑی تھی ایک وقت میں کئی کئی کام شروع کر دیتی۔اور پایہ تکمیل تک ہشاش بشاش رہتی.....آہستہ آہستہ عافیہ نے گھر کے ہر چھوٹے بڑے کام کا اختیار دے دیا تھا ابھی بچوں کے پمپر زبدل رہی ہے تو ابھی لہسن پیاز چھیلا جا رہا ہے۔ابھی کپڑے دھو دھلا کے فارغ ہوئی تو ابھی برتن خشک کر کے رکھ رہی ہے۔زبین اب عافیہ کی ضرورت تھی اس کی قیمت بھی اسے ٹھیک ٹھاک ادا کرنا پڑتی۔جب چار مہمان آتے وہ اپنی خدمات بطور ماہر شیف پیش کرتی۔مہمانوں کی موجودگی میں ان کو چائے کافی دینا بعد میں برتن دھونا۔بچے ہوئے میں سے پورا استحقاق استعمال کرتے ہوئے اپنا حصہ الگ کر کے گھر والوں کے لیے چھوڑ کے جاتی.....طوفانی موسم آندھی اپنے اثرات چھوڑ کے جاتی تو زبین بی بی کمر کس لیتیں۔سوئچ بورڈ اور دروازوں کے ہینڈل تک چمکا کے چھوڑتیں.....اس کے بعد تعریف پر گزارہ نہیں کرتی تھی منہ پھاڑ کے حسب پسند کپڑے جوتا، برتن، جیولری قسم کی چیزوں کی طلبگار ہوتی.....عاطف اس فرمائشی پروگرام پر بہت چڑتا مگر عافیہ ایک ہی فقرہ کہہ کے منہ بند کراو دیتی.....مانگتی ہی تو ہے۔چوری تو نہیں کرتی.....ایمان داری کی بات یہی تھی کہ وہ بہت محنت اور محبت والی تھی۔سچ کہیں تو سو باتوں کی ایک ہی بات.....کہ زبین سے زیادہ اس کے بچے زبین سے مانوس تھے۔خیر یہ تو برسبیل تذکرہ زبین کے کارنامے بیچ میں آ گئے بات تو کرونا کی چل رہی تھی۔اٹھتے بیٹھتے عافیہ کو دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں یہ خود ہی چھٹی نہ مانگ لے.....اور ہوا بھی یہی دو چار دن تو۔باجی جی مسز امجد کی ملازمہ چھٹی پر چلی گئی ہے۔فلاں نے دو ماہ کا ایڈوانس دے کے ملازمہ کو واپس بھیج دیا۔عافیہ ہر بات سنی ان سنی کرتی رہی۔مگر اندر ہی اندر سے دل دہل جاتا ۔

''نامراد کہیں کی چھٹی مانگ ہی نہ لے''۔اس نے منہ بند کرنے کے لیے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں ہفتہ پہلے جو سوٹ اسے لے کے دیا تھا اس کے ساتھ کا جوتا بھی لے دیا۔میلا من کے ڈنر سیٹ کی پرانی فرمائش بھی پوری کر دی مگر دل پریشان تھا عاطف بھی صورت حال دیکھتے ہوئے خاموش تھا بیوی تین سالوں میں تین مرتبہ سی سیکشن سے بچے دنیا میں لا کے کچھ اور کرنے جوگی نہیں رہی تھی ایک روتا تو باقی بھی ساتھ ہی پنجم سُر میں شروع ہو جاتے۔ایک کو دودھ پیتا دیکھ کے باقی دو بھی دودو دودو کی فرمائش کرتے۔باپ الگ سے بیمار۔کرے تو کیا کرے۔چھٹی گو کہ زبین نے بھی نہیں مانگی تھی مگر پھر بھی عافیہ کی چھٹی حس مسلسل الارم بجا رہی تھی۔بالآخر اس کا ڈر اور خوف اختتام پذیر ہوا۔کالونی کے گیٹ پر موٹا سا تالا ڈال دیا گیا جو صرف اس وقت کھلتا جب کالونی کا رہنے والا اندر آنا چاہتا ملازمین کو سختی سے روک دیا گیا۔کالونی کے مالک نے کڑی شرائط پر بھی ملازمین کی اجازت نہیں دی۔

جس روز کالونی کی انتظامیہ کی طرف سے ڈیڈ لائن دی گئی اس دن زبین کام کے لیے عافیہ کے ہاں موجود تھی.....اس نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا۔بڑے دلار سے چھوٹے کی نیپی بدلی۔بڑے دونوں کو فیڈر دیا اور دونوں ہاتھ باندھ کے کھڑی ہو گئی۔

''جی باجی اب پیشگی تنخواہ بھی دے دیں جس کا اعلان حکومت نے کیا ہے''۔

''لیکن تنخواہ تو تمہیں میں نے پرسوں دی تھی''۔عافیہ نے کہا۔

''اوہو پیاری باجی جی آنے والے اور اس ماہ کی''۔اس نے دانت نکوسے۔

مرتی کیا نہ کرتی اس نے نیلے ہرے نوٹ مٹھی بھر کے ساتھ سوسو کے بھی ہتھیلی پر رکھے۔دل صدمہ سے پھٹا جارہا تھا اگر غیب کا ذرہ بھر بھی علم ہوتا تو عقیقہ کے گوشت کے ساتھ ہی نقدی اور سوٹ نہ دیتی۔اگر مستقبل کا خوف نہ ہوتا کہ یہ کہیں منحوس چھٹی نہ کر جائے تو دو دن قبل تنخواہ کے علاوہ جو ڈنر سیٹ جوتے کپڑے منہ بند کرنے کے لیے دیے تھے وہی نہ دیتی مگر.....آہ.....وہ عالم غیب تو نہیں تھی۔

''اور باجی جی! آپ نے اوپر لینے والی چادر کا کہا تھا کرونا میں کہیں نکلنا پڑ ہی جائے گا مرنا جینا تو انسان کے ساتھ ہی لگا ہوا ہے.....بندہ ذرا اچھے حلیے میں ہی جاتا اچھا لگتا ہے''۔

اندر سے کلستے ہوئے عافیہ نے بظاہر مسکرا کے چادر بھی تھما دی۔

''وہ باجی جی مجھے ایک کام تھا بھائی جان سے اگر آپ کہہ دیں تو''۔وہ منمنائی۔

''کیا بات ہے زبین مجھے بتاؤ''۔عافیہ نے کہا۔

''وہ باجی جی بھائی جان تو اخبار میں کام کرتے ہیں سب قنون کا ان کو علم ہے ان سے کہیے وہ ہمارے مالکوں کو فون کر دیں مکان کا کرایہ ویسے تو اعلان ہو گیا ہے معافی کا کہیں وہ مانگنے نہ آجائیں''۔اس کی موجودگی میں مکان کے کرائے کی معافی کا فون بھی کروایا۔

''باجی جی آپ کو نہیں پتہ ساری بیگمات نے راشن دے کے بھیجا ہے آپ کی طرف سے بھی مل جائے تو آج ہی لے جاؤں۔کل کس نے دیکھی ہے''۔

عافیہ کے جی میں تو آیا کہ منہ توڑ کے جواب دے۔ہفتہ دس دن قبل سے جو جو چیزیں بمعہ دو کلو مٹھائی کے لے کے گئی ہے وہ کیا جانوروں کا کھا جا تھا۔مگر آہ چپ ہی بھلی۔خاموشی سے آٹا، چینی، چائے، چاول، دالیں، صابن پیکٹ بنا کے دیں۔شیمپو اور دو چار سینی ٹائزر، ٹشو رول وہ خود ہی مانگ کے لے گئی۔عافیہ نے اپنی بے بسی اور زبین کی قسمت پر اشک بہائے۔کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کو سسرال کے لیے وداع کرتی ہو گی جو یہ میڈم سرتاپا مالا مال ہو کے گئیں.....زبین کی رخصتی کے بعد عافیہ بھی خم ٹھونک کے میدان میں آ گئی۔چھوٹے چھوٹے کام نبٹا کے کپڑوں کی دھلائی کے بعد باورچی خانے کا رخ کیا۔ابھی آٹا گوندھ رہی تھی کہ چھوٹے عبدالوہاب کے رونے کی آواز پر ہاتھ دھو کے پرات ڈھک کے نکلی۔اس کا پمپر تبدیل کیا، اسے دودھ پلایا۔دونوں اللہ جانے کیسے لان کے گملوں سے مٹی میں اٹ کے آئے تھے ان کو نہلایا کپڑے بدلے۔سیری لیک کھلایا تو تیسرا نمبر پھر زور زور سے ٹانگیں مار رہا تھا۔پمپر سے پیشاب کے ساتھ دوسری سرگرمی بھی وقت مانگ رہی تھی۔تینوں کو سلا کے باورچی خانے میں پہنچی تو میاں صاحب کھانے کی طلب میں ناک سکیڑتے داخل ہوئے۔

''ابا جی کہاں ہیں''۔خلاف معمول گھمبیر خاموشی پر دونوں چونکے.....عافیہ کے اندر بھاگنے کی ہمت نہیں تھی۔انڈے کا خاگینہ اور روٹی بنا کے کمرے سے نکلی تو سامنے عاطف نظر آیا۔چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''خدا خیر کرے کیا ہوا؟''۔عافیہ گویا ہوئی۔

''ابا جی غسل خانے میں گر گئے تھے اور اٹھ نہیں پا رہے تھے۔بڑی مشکل سے انہیں پلنگ تک لے کے گیا ہوں بظاہر تو ایک جگہ پر نیل سا پڑا ہے مصیبت یہ کہ ہسپتال بھی نہیں جا سکتے''۔نت نئے پکوانوں کے شوقین عاطف نے انڈوں کا خاگینہ بغیر چوں چرا کیے کھانا شروع کیا مگر باپ کی بلند آواز پر کھانا چھوڑنا پڑا۔آزمائش پر آزمائش دکھ پر دکھ۔صدمہ پر صدمہ کا اب مطلب سمجھ میں آیا۔اس کے بعد دن رات کے چوبیس گھنٹے مصروفیت کے۔ریاضتوں کے۔قبول ہو گئیں تو عبادتوں کے۔سسر کے کولھے کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی جبکہ ٹانگ پر کہیں اندرونی چوٹ تھی ہلنے جلنے سے مجبور و معذور!

جتنی دعائیں یاد تھیں عافیہ رب سے مانگتی۔ایک ایک لمحہ گھنٹے کی مانند ہو گیا۔ایک گھنٹہ پورے دن کی طرح۔اپنے ٹانکے کون سا ٹھیک ہو گئے تھے زخم ابھی کچا تھا کہ کرونا کی مار پڑ گئی۔تیسرے دن عافیہ کی بس ہو گئی جی میں تھا اڑ کے ماں کی گود میں منہ چھپا لے، لمبی تان کے

سوجائے۔مگر وہ تو اب نیند میں بھی جاگتی تھی۔کبھی سسر کی آواز پر ہڑبڑا کے اٹھتی کبھی چھوٹے کی آواز پر جتنا چھوٹا تھا آواز خیر سے اتنی ہی بھاری بھرکم اور مردانہ۔بھونپو کی طرح محسوس ہوتی۔گزشتہ چار دنوں سے وہ ڈھنگ سے سو نہیں سکی تھی۔پانچوں دن وہ خود بیمار پڑ گئی۔زخم میں سے ناقابل برداشت درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔وہ جتنا چیخ روکنے کے لیے منہ بند کرتی اس کے کراہنے کی آواز اتنی ہی بلند سنائی دیتی۔

چھٹے دن وہ شاید بے ہوش ہوگئی تھی جب عاطف نے زیبن کو فون کیا۔عاطف کے دوست کی بیوی ڈاکٹر تھی وہ مکمل ریسٹ مناسب خوراک اور ہائی ڈوز کی اینٹی بائیوٹک ادویات دے کے عاطف کی تھوڑی سی کھچائی بھی کر کے گئیں۔

''عاطف بھائی آپ کو نہیں علم بھابی جس حالت میں ہیں اور پے در پے آپریشنز کی وجہ سے ان کی کیا حالت ہے؟''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد زیبن کو فون پر منت سماجت کی گئی گھر کے نازک حالات کا دردناک نقشہ کھینچا گیا کہ شام میں اس نے آنے کی حامی بھر لی۔

دن ڈھلے جب وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو چائے پیتے عاطف اور عافیہ ٹھٹکے۔کوئی مسز آپ سے ملنے آئی ہیں۔عاطف نے خیال ظاہر کیا۔بورجان کے نفیس جوتے، ڈیور کا کلچ اور خوبصورت عبایا میں وہ خاتون اندر لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

''باجی جی السلام علیکم!'' زیبن نے جاندار آواز میں سلامتی بھیجی۔

''تم؟'' عافیہ حیران ہوئی۔ہاتھوں کی انگلیوں میں نازک انگوٹھیاں کانچ کی چوڑیوں سے بھرے بازو مہندی لگے ہاتھ۔کوئی اداتھی اس کی سلام کرنے والی۔جیسے سولہ سنگھار کیے نئی نویلی دوشیزہ۔اک آہ سی عافیہ کے ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی۔کوئی انجان یا ان دیکھا بندہ آئے تو عافیہ روکھے لہجہ میں کہے۔چل بی بی گھر میں بیٹھ کرونا میں بھی تجھے دردر پھرنے مانگنے کا شغل سوجھ رہا ہے۔مگر.....یہ تو زیبن تھی!

خوشبوؤں میں بسا عبایا زیبن نے اتار کے مخصوص کھونٹی پر لٹکایا۔پاؤں ہیل والے جوتوں سے باہر نکالے۔انگوٹھیاں اتار کے کلچ میں ڈالیں اور چائے کے خالی کپ اٹھاتے ہوئے بولی۔

''باجی جی وہ بدتمیز گیٹ والا اندر نہیں آنے دے رہا تھا۔کہاں جانا ہے پھر میں نے اس کو چار سنائیں میں نے کہا آرام سے رہو میری کزن کے سسر کا فریکچر ہوگیا ہے میں نے عاطف بھائی کے ہاں جانا ہے۔تو بڑی مشکل سے آنے کی اجازت ملی بدتمیز مڑ مڑ کے مجھے دیکھ رہا تھا ان بدتمیزوں کو بہت سخت پہچان ہوتی ہے پر مجھے کیا''۔اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور باورچی خانے میں داخل ہوئی۔چند ہی منٹوں میں برتن دھو دھلا کے ریک میں رکھے، کھانا بنایا پھر کپڑوں کی دھلائی کے لیے لانڈری کا رخ کیا۔

رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔عافیہ کی چند لمحوں کے لیے آنکھ لگی تھی کہ لانڈری سے زیبن کے کھلکھلا کے ہنسنے کی آواز آئی۔وہ چوکنا ہوئی۔

وہ جنوں کی طرح کام کرتی تھی کہیں جنی تو نہیں بن گئی یا جن تو عاشق نہیں ہوگیا۔وہ خبر گیری کے لیے بستر سے اٹھی، دو قدم پر لانڈری تھی۔جونہی ادھر قدم رکھا زیبن کے منہ سے اپنا نام سن کے ٹھٹکی۔

''اللہ میرے اب کسی اور مصیبت سے بچانا''۔عافیہ کو دیکھ کے زیبن مسکرائی۔

''باجی جی چھوٹے کپڑے دھو دیے باقی تو صبح واشنگ مشین میں دھلیں گے۔آپ کا بخار کیسا ہے اب؟'' وہ عافیہ کی دلی کیفیت سے بے نیاز بولے جارہی تھی۔

''زیبن سچ سچ بتاؤ ابھی تم کس سے بات کر رہی تھیں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی عافیہ نے لہجہ سخت کیا۔

زیبن ٹھٹھا لگا کے ہنسی۔

''اوہ باجی جی میں اپنے ابے سے بات کر رہی تھی!''

''کہاں ہے تمہارا ابا؟'' اس نے سراسیمہ ہو کے پوچھا۔

'' اوہ.....وہ وہ.....باجی جی باہر نہیں یہ.....اس.....میں ہے''۔اس نے پاس پڑے کلچ سے اوپو کا اینڈرائیڈ فون نکالا۔

''یہ تو بہت مہنگا ہے''۔ بے ساختہ عافیہ کے منہ سے نکال۔

''ہاں جی باجی جی تیس ہزار والا ہے پر مجھے تو اٹھارہ ہزار میں مل گیا!''فخر سے زبین نے بتایا۔

''پھر بھی ..... اٹھارہ ہزار؟''۔عافیہ کو چار دن میں اس کی ایمانداری کی صفت پر شک ہوا۔

''افوہ.....باجی جی کیا ہوا۔کیا ہم اتنے ماڑے ہیں کہ اپنی مرضی سے کوئی چیز نہیں لے سکتے۔یہ میرا بھائی جن کے ہاں کام کرتا تھا وہاں سے سترہ ہزار میں لایا تھا اور یہ انگوٹھی۔اس نے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی آگے کی جس میں نازک سی انگوٹھی تھی۔یہ میں نے پورے تیس ہزار کی خریدی ہے۔ہمارے محلے میں بڑا مشہور بابو سنار رہتا ہے اس کی بیوی میری سہیلی ہے اس نے بتایا تھا سونا آگے جا کے لاکھ سوا لاکھ روپے تولہ ہو جائے گا۔میں نے سوچا چل بھئی زبین رب نے تیرا ہاتھ پھڑ ہی لیا ہے تو فیدہ اٹھا۔آپ کے عقیقے کے موقع پر دیے پانچ ہزار روپے تو پہلے کے پڑے تھے دو ماہ کی ایڈوانس تنخواہ بھی سولہ ہزار جمع ہوگئی۔اللہ سوہنا بھلا کرے باجی جی آپ نے جو گوشت دیا تھا ہم نے سری رکھی تھی باقی سارا فروخت کیا تو تین ساڑھے تین ہزار روپے اس کے بھی ہوگئے۔ابے نے حکومت والے بارہ ہزار لیے تھے خجل خوار تو بہت ہوا لمبی لین میں کئی گھنٹے کھڑا ہوا مگر اس میں سے بھی آدھے ابے نے مجھے دیے۔باقی یہ کہ کرونا امیروں کا ڈر ہے ہم غریبوں کو اس نے کیا کہنا ہے۔اماں نے شمع سینٹر والوں سے گجر سویٹ والوں سے کلیم ہوسنگ کلونی والوں سے راشن لیا۔اللہ بھلا کرے آپ کی جمات والوں کے جن کے درسوں میں کبھی کبھی آپ جاتی ہیں وہ تو سوکھا گیلا راشن گھر میں دے گئے۔چھوٹے بھائی نے بھی کئی جگہ سے جمع کر لیا اس کے علاوہ ہمارے محلے میں باجی شادہ کا پارلر ہے۔خفیہ طریقے سے وہ بھی چل رہا ہے انہوں نے مجھے کام کے لیے بلایا۔گیٹ سے تو کوئی نہیں جا سکتا پارلر کے پیچھے دروازے سے جاتی ہوں۔عورتیں بھی آتی ہیں، پارٹیاں بھی ہوتی ہیں، شادیاں ویاہ بھی ہو رہے ہیں۔میں مفت میں ہنر بھی سکھ رہی ہوں۔مفت میں کوئی سودو سو بھی دے جاتی ہے دلہن.....باقی کوئی کریم لوشن بھی مانگ تانگ کے لے ہی لیتی ہوں''۔

عافیہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور خدا کی بے نیازی پر حیران تھی جو پتھر میں بھی کیڑے کو روزی دیتا ہے۔باتوں باتوں میں زبین نے جتا دیا تھا کہ:

''پارلر کی ٹینشن وخت ویلا کم ہے۔وہیں کام کا سوچ رہی ہوں۔باجی جی آپ ٹینشن نہ لینا میں صبح ادھر سے کام کر کے پارلر چلی جایا کروں گی۔کون سا ساری زندگی کرونا کی مار پڑے گی آخر ایک نہ ایک دن تو سب ٹھیک ہو ہی جائے گا''۔وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

رب کی شان پر عافیہ حیران تھی کرونا ہے یا ڈرامہ۔کہیں امیر بھی رگڑا کھا گئے اور کہیں غریب بھی مال مال ہو گئے۔اور کیا کہتی سبحان اللہ یا استغفر اللہ.....جو بھی تھا ہے تو اللہ کا ہی رنگ۔فکر فاقے سب اس کے لیے جو معاشی فکروں سے آزاد ہے اور جسے فکر معاش میں مبتلا ہونا چاہیے تھا وہ آزاد۔فکر نہ فاقہ تے عیش کر کا کا۔

☆.....☆.....☆

غزالہ عزیز

فیصلوں کے سراب

موسم بہت حسین تھا۔ بادل کے دبیز ٹکڑے فضا میں مٹر گشت کر رہے تھے۔ سورج اپنی روشنی اور دھوپ لے کر نکل تو آیا تھا لیکن بڑا شرمندہ شرمندہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جلد ہی بادل اپنے مزید دبیز ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بڑی سی ردا تیار کر لیں گے جو ساری فضا کو اپنے حصار میں لے لے گی اور موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی۔

ریسٹ ہاؤس کے باغ میں جنگلی گلابوں کے پودے جھاڑیوں کی شکل میں اُگے ہوئے تھے جو باڑھ کا کام بھی دے رہے تھے۔ سرخ گلابی پیلے اور اورنج گلابوں کے گچھے ساری باڑھ پر جگہ جگہ پتوں سے سر نکالے مسکرا رہے تھے۔ وہ اتنے ملے جلے تھے کہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کہاں ایک رنگ کے گلاب کی جھاڑیاں ختم ہوتی ہیں اور دوسرے کی شروع ہوتی ہیں۔

یہ جھاڑیاں پورچ اور باغ کو الگ کر رہی تھیں درمیان میں جگہ جگہ کاسنی اور زرد ننھے ننھے پھولوں کے چھوٹے چھوٹے پودے گول اور مستطیل کیاریوں میں ترتیب سے لگے تھے۔ باغ کے درمیانی راستے سرخ اینٹوں سے لہراتے بل کھاتے جا رہے تھے ننھے بچے دوڑتے بھاگتے باغ میں نظر آ رہے تھے۔ ان کے والدین آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے باتوں میں لگے تھے۔ انہیں بچوں کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ کئی لڑکے ریسٹ ہاؤس کی مخصوص وردی پہنے باغ اور ڈرائیوے کے درمیان مستعد تھے۔ گیٹ پر چوکیدار اور سکیورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ جب کوئی نئی گاڑی اندر آتی وہ گیٹ کھول کر انہیں راستہ دکھاتے اور لڑکے اس بات پر نظر رکھتے کہ بچے باغ سے اترنے والی سیڑھیوں تک نہ آنے پائیں۔

زوبیہ پہلی منزل کے کمرے میں مقیم تھی اور بالکونی میں بیٹھی نیچے کی سرگرمیاں دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ سامنے رکھی تپائی پر چائے کے ساتھ چند لوازمات رکھے تھے۔ لیکن وہ اعظم کا انتظار کر رہی تھی جو آدھے گھنٹے کا کہہ کر گیا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا لیکن اعظم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ زوبیہ کو گھبراہٹ ہوئی نہ جانے کہاں چلے گئے، اُس نے سوچا۔

زوبیہ شادی کے بعد پہلی دفعہ اعظم کے ساتھ شمالی علاقوں کی سیر کو نکلی تھی۔ اگرچہ شادی کو ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔ لیکن اعظم نے اس طرح گھومنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا نہ ہی زوبیہ نے اس سے کہا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے روز شب سے مطمئن تھی۔ سارے کام اعظم کی مرضی کے مطابق کرتی۔ کھانے اُس کی پسند کے مطابق بناتی یہاں تک کہ تیار بھی ویسی ہی ہوتی جیسے وہ چاہتا۔ رنگ بھی وہی پہنتی جو اُسے پسند تھے۔ لیکن اسے کسی ستائش اور تعریف کا انتظار نہیں ہوتا تھا۔ وہ سب کچھ کر کے اعظم کو مسکرا کر دیکھتی کہ وہ کیا محسوس کر رہا ہے۔

یہ ایک بڑی عجیب بات تھی۔ لیکن زوبیہ ایسی ہی تھی۔ اعظم اس کے اس طرز عمل پر دل ہی دل میں حیران ہوتا تھا۔ پھر خود سے ہی کہتا کہ ایسی بیوی تو دنیا کی بڑی نعمت ہے اعظم! اور تم اس نعمت کی قدر نہیں کر رہے ہو..... وہ احساس جرم محسوس کرتا تھا جو ایک بیج کی طرح اس کے دل میں نہ جانے کب پھوٹا اور آہستہ آہستہ کونپل سے آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے یہ احساس کا پودا بڑھ رہا تھا اعظم جیسے کسی بوجھ تلے دبتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے دل سے کہتا، کیوں ایک بے وفا کی یاد میں ڈوبے رہتے ہو؟ الفت جہاں نے اُن وعدوں کا پاس نہیں کیا جو لڑکپن سے جوانی تک کیے تھے۔ وہ باتیں اسے یاد نہیں تو تم کو بھی یاد نہیں کرنی چاہئیں۔ اُس نے تمہارا انتظار نہیں کیا..... ایک امیر تاجر کا رشتہ آنے پر سب کچھ بھلا دیا۔

وہ سمجھتی تھی کہ اعظم کو ابھی کامیاب ہونے کے لیے بہت محنت

D/Arshad hussain/batool/batool2020/ june2020

کرنی ہے اور کیا پتہ اس کی محنت رنگ لائے گی بھی یا نہیں۔ بس پھر نہ رشتے داری نہ بچپن کی محبت نہ وعدے نہ قسمیں..... کچھ بھی تو اسے بے وفائی سے روک نہ پائیں۔ وہ اس کے دل پر پاؤں رکھ کر رخصت ہو کر سات سمندر پار چلی گئی..... ہنی مون منانے! روز نئی نئی تصویریں نئی نئی جگہ کی اپنے سٹیٹس پر ڈالتی۔ اعظم نے تو اپنا اکاؤنٹ ہی ڈیلیٹ کر دیا اس کی دو چار تصویروں کے بعد..... لیکن خبریں تو کزنز سے ملتی رہتی تھیں۔

وہ شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں نے سمجھا بجھا کر شادی کے لیے آمادہ کیا۔ وہ بھی آخر یہ سوچ کر آمادہ ہو گیا کہ مجھے بھی الفت کو جلانا چاہیے..... لیکن یہ سوچ کوئی دس بارہ سال گزار کر ہی پیدا ہوئی۔

زوبیہ اس کی ماں کی پسند تھی۔ اعظم سے کوئی پندرہ سال چھوٹی تھی۔

نیچے کھیلتے بچوں نے خوشی سے نعرے لگائے کیونکہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ شور سے زوبیہ چونک گئی۔ ان بچوں کو دیکھا جو بارش میں اچھل رہے تھے۔ لیکن اُن کے والدین نے جلد ہی ان کو قابو کر لیا۔

''چلو بھئی بچو طبیعت خراب ہو گی تو گھومنے کا سارا مزہ خراب ہو جائے گا''۔

اب نیچے کا لان خالی تھا۔ ذرا دیر پہلے کی گہما گہمی سناٹے میں بدل گئی تھی۔

خیالوں میں زوبیہ یونیورسٹی کے دور میں پہنچ گئی تھی۔ ایسی ہی ایک یاد تھی۔ اچانک بارش شروع ہو گئی تھی اور ساری لڑکیاں بارش میں بھیگنے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والے لان میں جمع تھیں۔

''بس جیسے ہی بس آئے گی نکل جائیں گے..... گھبراؤ نہیں'' وہ ایک دوسرے کو دلاسہ دے رہی تھیں۔

زوبیہ ذرا شیڈ میں کھڑی پھولوں پتوں اور گھاس کو نہاتا دیکھ رہی تھی۔ بارش کا ہر قطرہ اس کے چہرے سے مٹی صاف کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے چہرے چمک اٹھے۔ وہ انتہائی محویت سے دیکھ رہی تھی۔

شور اٹھا تو پتہ چلا پوائنٹ کی بس آ گئی ہے۔ سب لڑکیاں بھاگیں۔

زوبیہ سوچ ہی رہی تھی کہ آصف کی مہران اس کے سامنے رکی۔ آصف اس کے ڈیپارٹمنٹ کا سینئر اور انتہائی ذہین لڑکا تھا۔ زوبیہ کو پسند تھا زوبیہ اور آصف دونوں ہی کی آنکھیں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا اٹھتی تھیں۔ کچھ ان کہے سے رشتے تھے۔

''لیکن ان کہے بے نام رشتوں کا کیا بھروسہ آصف؟'' ایک دفعہ آصف نے پسندیدگی کا اظہار کیا تو زوبیہ نے کہا تھا۔

''بس چند سال کی بات ہے میں ذرا باہر سے ڈگری لے کر آ جاؤں''۔

''چند سال؟''

اگر انتظار کی آگ میں رکھنا چاہتے ہو تو کسی بندھن کے لیے اپنی ماں کو بھیجو..... ورنہ.....''

''ورنہ؟''

''ورنہ میں وہ ہی کروں گی جو میرے والدین چاہیں گے''۔

زوبیہ نے اس کو صاف کہہ دیا۔

بارش کی بوندیں تیز ہو گئی تھیں لیکن زوبیہ مہران کے کھلے دروازے کو نظر انداز کر کے بس کی طرف بڑھ گئی خوب جانتی تھی بھلا کیسے ایک تنہا لڑکی کسی غیر لڑکے کی گاڑی میں بیٹھ سکتی ہے! زوبیہ کو تو آصف کا گاڑی روکنا اور دروازہ کھول کر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرنا بھی بہت ناگوار گزرا تھا۔

بعد میں بھی کئی دفعہ آصف نے اُسے روک کر بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن زوبیہ کا صرف ایک جملہ ہوتا تھا کہ ''اگر آپ سنجیدہ ہیں تو اپنے والدین کو بھیجیں''۔

آصف نے اپنے والدین کو نہیں بھیجا اور اسکالرشپ پر آناً فاناً باہر چلا گیا۔

زوبیہ کا دل بہت اداس ہوا۔ اس نے سوچا کہ آصف یقیناً سنجیدہ نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے آصف کی کسی بھی بات کو نہ دل پر لیا اور نہ ہی کسی بھی موقع پر اس کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کی۔

بارش کی بوندیں جیسے اس کو یادوں کی نگری میں لے گئی تھیں ویسے واپس بھی لے آئیں۔ اس کو اعظم کا خیال آیا پتہ نہیں بارش میں بھیگ نہ گئے ہوں۔ اس نے میز پر رکھا موبائل اٹھایا پہلے بھی دو دفعہ ملا چکی تھی مگر اعظم کا موبائل مصروف جا رہا تھا۔ اس دفعہ پہلی بیل پر ہی اعظم نے اٹھا لیا۔

''کہاں ہیں اعظم؟''

''بس دروازے پر میری جان!''

زوبیہ حیران سی ہوگئی۔ ایسا طرز تخاطب..... اتنے عرصے بعد؟ شادی کو ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اعظم نے کبھی اسے ایسے نہ پکارا تھا..... شاید یہ ایسے رومانوی موسم کا اثر ہے، اس نے سوچا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اعظم اندر آ گیا تھا۔ زوبیہ بالکونی کا دروازہ بند کر کے کمرے میں آ گئی تھی اعظم کا کوٹ تھوڑا سا گیلا تھا۔ زوبیہ نے قریب آ کر اعظم کے شانوں کو چھوا۔

''آپ کا کوٹ گیلا ہو گیا چھتری لے کر نہیں گئے تھے؟''

''ہوں ..... لے کر گیا تھا لیکن پھر بھی کچھ بوندیں تو کوٹ پر آ گئیں..... دیکھو سر تو گیلا نہیں ہوا''۔ اعظم نے زوبیہ کا ہاتھ پکڑ کر بالوں میں لگایا اور نیچے لاتے ہوئے لبوں سے لگا لیا۔ چہرے پر شرارتی سی ہنسی تھی۔

یہ تو کچھ مختلف اعظم لگ رہے ہیں ..... جاتے ہوئے تو کتنے سنجیدہ تھے۔ زوبیہ نے سوچا۔

بس آدھا گھنٹہ..... نہیں شاید ایک گھنٹہ..... کیا تبدیلی کے لیے ایک گھنٹہ بھی کافی ہے؟

ایک گھنٹہ کیا کبھی کبھی تو ایک لمحہ بھی انسان کو بدل دیتا ہے..... بس وہ لمحہ دل کو چھوتا ہوا گزرا ہو۔

زوبیہ نے ساری سوچوں کو جھٹک دیا۔ ابھی وہ اعظم کے اس انداز محبت کو محسوس کرنا چاہتی تھی خوش ہونا چاہتی تھی کہ ایسی خوشی کو وہ ترس رہی تھی ..... اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ جاتی تھی لیکن اب اعظم بدل گئے تھے..... اور پھر بدلتے ہی چلے گئے۔

وہ لوگ ایک ہفتے ''سنگم'' میں رہے لیکن اب زوبیہ کے پاس نہ وقت تھا اور نہ ہی ضرورت کہ وہ بالکونی میں بیٹھتی، بچوں کی سرگرمیوں کو دیکھتی یا اعظم کا انتظار کرتی۔ اب تو وہ اور اعظم روز ناشتے کے بعد نکل جاتے۔ مناظر نہیں دیکھتے بلکہ مناظر انہیں دیکھتے۔ وہ تو بس ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے میں گم رہتے۔ پہاڑی ڈھلوان کے ساتھ سیدھی صاف سڑک سبزہ بلند درخت پرندوں کی چہچہاہٹ نیلا آسمان یا پھر بادل سے ڈھکا..... جیسے ہی بوندیں گرنا شروع ہوتیں زوبیہ ہاتھ میں پکڑی چھتری کھول دیتی اور وہ لوگ تیز قدموں سے واپسی کے راستے پر چل پڑتے۔

آسمان صاف ہوتا تو سڑک کے کنارے بنے کسی چھوٹے سے گھاس کے قطعے پر لگے پنچوں پر بیٹھ جاتے۔ باتیں بھی ہوتیں۔ وہ ہی بات ہے کہ زندگی کی کہانیاں ختم نہیں ہوتیں۔ پھر زوبیہ ریسٹ ہاؤس کے کچن سے بنوائے لنچ باکس کو کھولتی۔ اگر پانی کی بوتل ختم ہوگئی ہوتی تو وہ لوگ راستے میں آنے والے کسی جھرنے سے بھر لیتے۔

وہ ایک ہفتہ دونوں کو خوب ہی سیراب کر گیا۔ محبت کا پودا کونپل کے بجائے اب مضبوط بنیاد پر کھڑا تھا لیکن نہ زوبیہ نے کبھی پوچھا کہ وہ ایک گھنٹہ کہاں گزار کر آیا کہ اتنا بدل گیا اور نہ اعظم نے کبھی خود بتایا۔

کتنا عرصہ گزر گیا۔ وقت مہربان رہا۔ اعظم کا کاروبار خوب بڑھا اور خاندان بھی ..... شہزاد، علیزے، فرزاد اور شانزے..... اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ اسکولوں میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ زوبیہ گھر اور بچوں میں خوب مصروف ہوگئی تھی۔

اس دن اعظم کے بزنس کے ساتھیوں کا ایک ڈنر تھا۔ سفید خوبصورت اسکارف اور آسمانی رنگ کے عبایا میں زوبیہ سادگی میں بڑی معصوم اور باوقار لگ رہی تھی۔ مسز کبیر اور سعدیہ حماد سے ہمیشہ ہی زوبیہ کی بنتی تھی۔ دونوں اعظم کے دوستوں کی بیویاں تھیں۔ زوبیہ ان سے باتوں میں مصروف تھی کہ اعظم نے اسے اشارے سے بلایا اور پھر قریب ہی آ گیا۔ دھیرے سے اس کا ہاتھ پکڑا، مسز کبیر اور سعدیہ حماد سے معذرت کی اور اس کو لے کر دوسری طرف پول سائیڈ پر لگی میزوں کی

طرف آ گیا۔

''کیا ہؤا اعظم؟''

''مجھے تم سے کسی کو ملوانا ہے'' اعظم نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

زوبیہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ تھا جو مختلف تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ جذبہ جو چہرے پر چھایا تھا خوشی تھی فخر تھا یا محبت.....زوبیہ سمجھ نہیں پائی۔

اتنے میں اعظم ایک میز کے پاس رک گیا۔ کھنچے ہوئے کمان ابرو اور نظر کے سحر انگیز تیر.....ترشے ہوئے ہونٹ سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ لپ اسٹک کا رنگ ایسا کہ کبھی قدرتی سا لگ رہا تھا اور کبھی شوخ.....زوبیہ اس خاتون کو دیکھتی رہ گئی۔ دوسری نگاہ اس کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھے شخص پر پڑی سیاہ کوٹ کی جیب سے جھانکتا آتشی گلابی رومال کا کونہ..... ہاتھ میں سگار لیے وہ میز پر بیٹھے سب ہی لوگوں سے مصروف گفتگو تھا۔

آصف کو پہچاننے میں زوبیہ کو چند لمحے ہی لگے۔ نجانے وہ کب تک شاک کی کیفیت میں رہتی مگر اعظم کی آواز نے اسے متوجہ کیا۔ وہ الفت سے مخاطب تھا۔

''معذرت قطع کلامی کے لیے.....میں دراصل زوبیہ کو ملوانا چاہ رہا تھا الفت سے۔ تو زوبیہ یہ الفت ہیں اور الفت یہ میری وائف زوبیہ.....''

کڑی کمانوں اور سحر انگیز آنکھوں والی الفت نے کھڑے ہو کر زوبیہ سے ہاتھ ملایا اور بولی ''بہت خوشی ہوئی اعظم تمہاری وائف سے مل کر۔''

پھر اس نے اپنے برابر بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کیا ''یہ آصف ہیں میرے ہزبینڈ''۔

لمبے لمبے رنگین ناخن والی انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں ..... ہیرے، زمرد، اور عقیق یہ تین پتھر تو ضرور ہی ہیں۔ پتھر تو قیمتی ہیں لیکن ہاتھ.....اور دعوت نظارہ دیتا اس کا پورا وجود.....اعظم نے دل میں سوچا کیا یہ مصنوعی ادائیں کبھی میری پسندیدگی کا محور تھیں؟ اس نے ساتھ کھڑی زوبیہ کے باوقار سراپے پر نظر ڈالی اور دل ہی دل میں شرمندہ ہؤا۔ زوبیہ کی معصوم باوقار خوبصورتی میں اس لمحے کچھ ایسا تھا جس کے سامنے الفت بھی خود کو کمتر محسوس کر رہی تھی شاید اسی لیے زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی جیسے وہ نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی توجہ بھی زوبیہ سے ہٹانا چاہ رہی ہو۔ البتہ آصف کی آنکھوں میں زوبیہ کے لیے کوئی پہچان نہ تھی۔

اعظم مسکرا کر الفت کی اوٹ پٹانگ باتیں سن رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ زوبیہ کو الفت سے متعارف کروانا چاہ رہا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ چند منٹ کے بعد جب سب ہی باتوں میں مصروف ہو گئے تو اعظم دھیرے سے زوبیہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل آیا۔

''یہ الفت کون ہیں؟''

''زوبیہ پیاری! ابھی نہیں گھر جا کر سب تفصیل سے بتاؤں گا ابھی تو محفل کے مزے لو.....تم نے کچھ کھایا نہیں؟'' اعظم زوبیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ مسز کبیر اور سعدیہ حماد کی میز پر بٹھا آیا۔

''زوبیہ کی محبت اعظم کے پور پور سے چھلکتی ہے''۔ مسز کبیر نے بات تو سعدیہ سے کی تھی لیکن دیکھ وہ زوبیہ کو رہی تھیں۔ انداز چھیڑنے کا تھا۔ زوبیہ ان کی شرارت پر مسکرائی.....پورے دل سے.....واپسی میں زوبیہ نے اعظم کو گاڑی میں سوالوں پر رکھ لیا۔

''بتاتا ہوں بھئی بتاتا ہوں.....ذرا دم تو لو''۔

اعظم نے ایک گہری سانس لی اور کچھ لمحے ٹھہر کر بولا۔

''تمہیں وہ دن یاد ہے جب سنگم ریسٹ ہاؤس میں تم کو چھوڑ کر گیا تھا؟''

زوبیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس رات اور اس وقت کے بارے میں سارے سوال جن کو اس نے بڑی مشکل سے تھپک تھپک کر سلایا تھا یکا یک جاگ اٹھے۔

''دراصل الفت اور اس رات کے درمیان گہرا رشتہ ہے''۔ یا اللہ! زوبیہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اعظم اس کے انداز پر مسکرایا۔

''الفت میری پسند تھی کالج میں ہم ساتھ تھے اور آئندہ ساتھ

رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔لیکن الفت نے ایک مالدار کا رشتہ آنے پر فوراً شادی کر لی''۔

مالدار؟ زوبیہ نے آصف کے بارے میں سوچا۔وہ تو کوئی ایسا مالدار نہ تھا زوبیہ کے دل میں اٹھے سوال کا جواب اعظم نے خود ہی دے دیا جب باقی بات بتائی۔

''یہ آصف اس کا تیسرا شوہر ہے۔پہلے شوہر سے اس نے خوب مال بٹورا اور پھر اس سے جان چھڑالی۔گھر بسانا اس کے خوابوں میں کبھی شامل ہی نہ تھا۔میں تو اپنی پسند پر اب خود شرمندہ ہوتا ہوں.....نو جوانی اور لڑکپن کے دور ایسے فیصلے کرنے کے لیے انتہائی ناپختہ اور ناتجربہ کار ہوتے ہیں۔جہاں تیل اور آگ ہوگی وہاں شعلہ تو اٹھے گا۔اکٹھے پڑھتے ہیں تو ایسی نادانیاں ہو جاتی ہیں''۔اعظم نے زوبیہ کو دیکھا۔

زوبیہ نے سر ہلایا بہت عرصہ پہلے وہ خود اسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی انتہائی غیر متوقع طور پر اعظم کے منہ سے یہی بات سن کر حیران ہو گئی۔لیکن ابھی تک اعظم نے اس رات کے اسرار پر سے پردہ نہیں اٹھایا تھا۔اس نے سوالیہ نظروں سے اعظم کو دیکھا۔اعظم اس کے تجسس پر مسکرا اٹھا۔

''اس رات میں نے الفت کی ساری نشانیاں پرزے پرزے کر کے کھائی میں پھینک دیں..... پتہ ہے دفنائیں کیوں نہیں؟ کیوں کہ محبت کی نشانیاں دفنائی جاتی ہیں عزت احترام اور محبت سے..... جب کہ میرے پاس اس کے لیے ایسا کوئی جذبہ ہی باقی نہ تھا..... بلکہ وہ محبت ہی کہاں تھی کہ پائیدار ہوتی .....بس ایک سراب جیسا جذبہ تھا جس کے پیچھے میں بھاگتا چلا گیا تھا اور اس بات کی خبر مجھے بہت بعد میں ہوئی''۔

اعظم نے زوبیہ کا ہاتھ محبت سے دبایا مگر زوبیہ.....وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ آصف بھی دولت ہی کا پجاری نکلا۔اپنی عمر سے بڑی مگر مالدار عورت کو پھانسا اور اب اپنے خواب پورے کر رہا ہے۔شکلوں سے انسانوں کا کیا پتہ چلتا ہے! خدا کا شکر ہے کہ میں غلط فیصلہ کرنے سے بچ گئی۔

دونوں اپنے اپنے دل میں جذبات کے طوفان سنبھالتے رہے .....گاڑی میں خاموشی تھی لیکن اس خاموشی میں سکون خوشی اور اطمینان کا گہرا احساس تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر میمونہ حمزہ

ویران کر گیا

امتحانات ابھی مکمل بھی نہ ہوئے تھے کہ حالات نے پلٹا کھایا۔ ابتدأ خبروں میں ایک آفت کا ذکر ہوا، جس نے بڑی تیزی سے دنیا کے کئی ممالک کو متوجہ کر لیا۔ ابھی حقیقت اور افواہوں کی گردش جاری تھی کہ دنیا نے اپنے اپنے دروازے بند کرنے شروع کر دیے۔ ہر صبح ایک نئی خبر کے ساتھ احتیاطی تدابیر کے نت نئے نسخے اور انوکھے انتظامات! ایسا ہول اٹھا کہ گلوبل ولیج کا تصور پاتی دنیا نے یک دم ہی دوسروں سے منہ پھیر لیا.....نہ مروت کام آئی نہ مودت.....سب نے اپنے ہاں داخلے پر قدغن لگا دی۔ نہ ہوائی سفر ممکن رہا نہ زمینی! ایک بظاہر نہ دکھائی دینے والا وائرس (یا وبا) جہاں پہنچا، زندگی اور اس کے معمولات کو ہلا کر رکھ دیا۔ اولادِ آدم کی زندگی ہی نہیں نفسیات پر بھی اثر انداز ہو گیا۔ انسانوں کی زندگی کی رنگا رنگی.....قرب کے نشاط.....محبت کے لازوال رشتوں کو ''احتیاط اور فاصلہ'' سے روشناس کروا گیا۔

وہ ان ہنگاموں سے کافی دور تھا، اور اپنی ہی روٹین میں مگن! یہ اس کے سال کے مصروف ترین دن تھے، اس کے سکولوں میں سالانہ امتحانات ہو رہے تھے، وہ کبھی ایک کیمپس میں ہوتا اور کبھی بھاگ کر دوسرے کی خبر لیتا۔ اساتذہ کے ساتھ میٹنگز اور کبھی والدین کو یاد دہانی کے اعلانات۔ کالج کے طلبا کے نصاب کی تکمیل کی فکر! اگرچہ وہ تقریباً دو دہائیوں سے اس میدان میں مصروفِ عمل تھا، لیکن وہ کسی چیز کو بھی روٹین کی نذر نہ ہونے دیتا۔ وہ ہر آن بہتری کے لیے سوچتا رہتا۔ ان دنوں اسے خبریں سننے کا بھی کم ہی وقت ملتا، گھر آتا تو بیٹیاں اس کی توجہ کا مرکز بن جاتیں۔

دنیا میں پھیلنے والی وبا کے اثرات بہت دن تک اس کے پر امن، سرسبز و شاداب قصبے کی فضاؤں سے دور نہ رہ سکے۔ پورے ملک کے تعلیمی ادارے ایک حکم سے بند ہوئے تو اس کا کالج اور سکول بھی بند ہو گیا، حالانکہ سالانہ امتحانات کا صرف ایک ہی پرچہ رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں اداروں کی انتظامیہ کو رات گئے بڑی کوفت کے ساتھ اگلے دن سے غیر معینہ مدت تک کے لیے سکول و کالج بند ہونے کا حکم نامہ جاری کیا تھا۔ صبح تک اس کی طبیعت پر بوجھ تھا، وہ کام مکمل کرنے کا عادی تھا۔ اب ایک پرچہ رہ جانے کی بنا پر اساتذہ نہ تو رزلٹ بنا سکیں گے، نہ نئی کلاسوں کا شیڈول بن پائے گا۔ وہ ہر سال امتحانات کا رزلٹ تیار کروا کر اپنے بچوں کو ننھیال لے جاتا تھا اور کچھ دن تفریح کے بعد پھر اسی معمول پر آ جاتا تھا، جہاں اس کا سکول اور کالج تھا۔ نانی کا گھر ان سب کا پسندیدہ مقام تھا، جہاں ان سب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا، وہاں پہنچ کر وہ کئی مہینوں کی تکان اتارتا، اور پھر نئے سیشن کی کتابوں، یونیفارم اور دیگر معاون اشیاء کے آرڈرز دینے کا کام بھی نمٹا لیتا۔ اس کا سکول کہنے کو تو قصبے کا سکول تھا، مگر تعلیم، نظم و ضبط اور ہم نصابی سرگرمیوں میں علاقے کے اچھے تعلیمی اداروں کو مات دیتا تھا، میٹرک اور ایف ایس سی کے امتحانات کے نتائج میں اس کے کالج کے طلبا نمایاں کامیابی پاتے، اور اب تو اس کے ہاتھوں کے تراشیدہ کئی ہیرے ملک کے اعلیٰ اداروں میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

اس نئی صورتِ حال نے سب کو ہی عجب پریشانی میں ڈال دیا تھا، اس کی بیٹیاں صبح سے کئی مرتبہ اس سے پوچھ چکی تھیں:

''نانی کے گھر کب جائیں گے بابا؟''

''اب تو ایک پرچہ رہ گیا تھا بابا''۔ اس کی بڑی بیٹی نے وضاحت کی، اسے خالہ کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔

''کتابیں ساتھ لے جاتے ہیں نا''۔ منجھلی کب پیچھے رہنے والی

تھی۔

اور وہ ہر مرتبہ انہیں ٹال دیتا۔ میڈیا پر آنے والی خبروں میں ملکی صورتحال واضح ہونے کے بجائے ایک ہنگامے اور الجھن کا منظر پیش کر رہی تھی، کہیں طلبا کے کیریئر اور تعلیمی نقصان کی باتیں تھی تو کہیں کاروبار کی بندش کی بنا پر معاشی بدحالی کی، کوئی مزدوروں کے بے روزگار ہونے کا رونا رو رہا تھا تو کوئی پورے ملک کو ''لاک ڈاؤن'' کرنے کے مشورے دے رہا تھا۔ وہ ریموٹ ہاتھ میں پکڑے مختلف چینلز سکرول کر رہا تھا، مگر ہر جانب ایک سی تشویش ناک خبریں تھیں اور انہیں خبروں میں لاری اڈوں اور بسوں کے اژدھام کا منظر بھی تھا۔ خبر بنانے والے نے کمال ذہانت سے ان سب مسافروں کو ایک ہی نام دیا تھا۔

''کورونا وائرس سے بچاؤ کی چھٹیوں میں عوام کی اکثریت نانی کے گھر جانے کے لیے گھروں سے نکل آئی، بیرونِ شہر جانے کے لیے اڈوں پر بھیڑ بڑھ گئی''۔

اس خبر کی تفصیل کیا تھی، اسے سننے کا کسی نے موقع نہ دیا۔ اس کی پیاری بیٹیاں شاید اسی کی منتظر تھیں۔ انہوں نے یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سامنے مطالبہ رکھ دیا۔

''بابا، سب جا رہے ہیں نانی کے گھر..... ہمیں بھی لے چلیں نا''۔

اس نے بیوی کی جانب دیکھا، اس کے چہرے کی چمک ہی میں اس کے سوال کا جواب تھا۔ اس نے چند لمحے سوچا، اور پھر بولا:

''بتائیے کب تک ہو سکتی ہے روانگی، دو ہفتوں کی چھٹی ہے۔ ایک ہفتہ کے لیے چلے جاتے ہیں، سکول کا رزلٹ اور اگلے سیشن کی تیاری کا کام واپس آ کر مکمل کر لیں گے''۔

اس کی تجویز تو گویا سب کے دل کی مراد تھی، سب نے اسے حکم نامہ ہی سمجھا، اور بھاگم بھاگ تیاری میں جت گئے، اور دوسرے ہی دن ان کی گاڑی فراٹے بھرتی نانی کے گھر کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ جہاں ہمیشہ کی طرح محبت بھرا پر تکلف استقبال تھا۔ چند دن تک انہوں نے خوب مزے کیے، کھیل کود اور تماشے میں نہ دن کا پتا چلا نہ رات کا! لیکن گھر سے باہر کے حالات بدل رہے تھے، فضا میں خوف سرایت کر رہا تھا، بہت سے لوگ جو ابتدا میں ان ہدایات کو درخورِ اعتنا نہیں جان رہے تھے، اب سنجیدگی سے اس کے اثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کے قصبے میں تو سب کو زوردار معانقے اور پرحرارت مصافحے ہی کی عادت تھی، وہ مسجد میں باقاعدگی سے جاتا، کتنے ہی پرانے واقف کار مل جاتے، اگرچہ مساجد میں بھی حاضری بتدریج کم ہو رہی تھی۔

ایک ہفتہ گزرا، پھر دوسرا، اور تیسرا بھی۔ اس نے کئی مرتبہ واپسی کا ارادہ کیا، مگر ملکوں کے دروازے بند ہونے کے بعد اب شہروں کے دروازے بھی بند ہو گئے تھے، باہر والوں کو اندر آنے کی اجازت تھی نہ اندر والوں کو باہر جانے کی! اب قصبے میں بہن بھائیوں سے رابطے کا ذریعہ سیل فون تھا، وہ جب بھی رابطہ کرتا، ایک ہی سوال سماعت سے ٹکراتا:

''واپسی کب ہوگی بھائی''۔

جس کا جواب اس کے پاس نہ تھا، وہ حالات کے دھارے پر تھا، جب چاہیں جہاں چاہیں لے جائیں۔

آنے کے چند روز بعد ہی اس نے بیٹیوں کا ایک شیڈول ترتیب دے دیا تھا، اور ان کی تعلیمی و تربیتی سرگرمیاں شروع کروا دی تھیں۔ وہ بچوں کو بہت دن فارغ رکھنے کے حق میں نہ تھا، کوئی نہ کوئی مثبت کام کرواتا رہتا۔ ان دنوں ان نے انہیں قرآن کریم کا کچھ حصّہ یاد کرنے کو بھی دیا، وہ خود بھی ان کے ساتھ حفظ کی کلاس کا طالب علم بن گیا، ہر روز زیادہ سے زیادہ سبق یاد کرنے کی کوشش ہوتی، مقابلہ اتنا زور دار تھا کہ بابا کے ساتھ منجھلی بیٹی نے بھی سورۃ یٰسین حفظ کر لی، باقی بچے بھی حفظِ مراتب کے ساتھ آگے پیچھے تھے۔ اور اب تو وہ ہر روز انہیں یاد دہانی کرواتا، ''واپسی کا پروگرام کسی بھی وقت بن سکتا ہے، سب اپنی چیزیں بھی سمیٹ کر رکھیں اور نظام الاوقات بھی ٹھیک کر لیں''۔

اور وہ سب ہی سر ہلا کر تائید کر دیتیں۔

اتنے دن سے گھر سے دوری نے اس پر کسلمندی طاری کر دی تھی۔ وہ گھنٹوں کمرے میں لیٹا رہتا، باہر نکلنے کو دل کرتا نہ خبریں سننے کو،

اور پھر اسے گلے میں سوزش کا احساس ہوا۔ وہ قریبی ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور اس نے معائنے کے بعد انٹی بائیوٹک تجویز کر دی۔ دو دن بعد وہ پھر کلینک میں کھڑا تھا۔ اسے ذرا آرام نہ آیا تھا، بلکہ اب تو کچھ بخار بھی محسوس ہو رہا تھا، جسم میں کمزوری بھی! ڈاکٹر نے اسے ڈرپ لگوانے کی ہدایت کی تو اس نے از خود کہا:

''ڈاکٹر صاحب، میرا کورونا ٹیسٹ کروا دیں''۔

''کورونا..... یہ کیسے خیال آ گیا آپ کو..... آپ میں تو اس کی علامات ہی نہیں ہیں۔ معمولی سا انفیکشن ہے اور بخار۔ جلد ٹھیک ہو جائیں گے''۔

وہ ڈرپ لگوا کر گھر آ گیا، لیکن طبیعت میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی۔ اگلی صبح وہ ڈاکٹر کے بجائے ڈپٹی کمشنر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے اس سے درخواست کی کہ وہ اسے واپس گھر جانے کا اجازت نامہ دے دے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گھر پہنچے گا تو مطمئن ہو جائے گا۔ قانون کا ہاتھ بڑا بے رحم ہوتا ہے، اسے واپسی کی اجازت نہ ملی۔ وہ بجھے دل کے ساتھ واپس آ گیا، اس دن اس کی جس سے بھی بات ہوئی اس نے سب کو دعا کے لیے کہا، وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا دل اتنا اداس کیوں ہے۔ اس کی صحت کی حالت ایسی بھی بری نہ تھی، لیکن وہ سب سے دعائیں سمیٹتا رہا۔

اگلی صبح اس کا سانس پھولنے لگا، وہ بڑی ہمت کر کے نماز کے لیے اٹھتا، عصر پڑھ کر واپس آیا تو حسبِ معمول بیٹیوں کو سورت حفظ کرنے کے لیے بٹھا دیا حالانکہ سانس پھولنے کے سبب بات کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس کیفیت میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ ہوا، کلینک والوں نے ابتدائی معائنے کے بعد ڈی ایچ کیو ہسپتال بھجوا دیا۔ ہسپتال میں پہنچتے ہی اسے قے آئی اور ایمرجنسی کے بستر پر اس کی دل کی حرکت بحال کرنے کی انتہائی کوشش کے بعد ڈاکٹرز نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر میں اس کے وارثوں کے ہاتھ میں ''ڈیتھ سرٹیفکیٹ'' تھا جس پر حرکت قلب بند ہونے کو موت کا سبب قرار دیا گیا تھا اور ڈیوٹی ڈاکٹر اور انتظامیہ نے تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔ اس کا بے جان وجود لیے نانی کا کنبہ ایمبولینس میں اس کے قصبے کی جانب جا رہا تھا..... فضا میں سسکیاں تھیں، کراہیں اور آہیں!

ہر شہر کا دروازہ بند تھا، چیک پوائنٹ پر تفصیلات بیان کی جاتیں، ڈیتھ سرٹیفکیٹ طلب کیا جاتا، اور تسلی کے بعد رکاوٹ ہٹا کر راستہ دے دیا جاتا، ایک شہر سے دوسرا..... اور پھر تیسرا..... پھر ایک جگہ اس دکھ اور غم میں ڈوبے کاروان کو روک لیا گیا۔ یہاں بھی ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا، یہ اس کے اپنے علاقے کی حدود کا آغاز تھا۔ اس مقام پر ایمبولینس تین گھنٹے رکی رہی تاکہ ان وارثوں کا تعین ہو سکے جنہیں اس کے شہر میں داخلے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ اس کی بیوہ، بچیاں، اور والدین ہی اس کے اہل قرار پائے اور قانونی بھائی کے خاندان کو واپس لوٹا دیا گیا۔

اس کی میت کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی پورا علاقہ اس کی جدائی کے دکھ میں ڈوب گیا تھا۔ اپنے علاقے کا پہلا انجینئر جو ڈگری یافتہ ہوا، تو اپنی ذات کے حصار سے بلند ہو کر سوچا، اور محض اپنے لیے ملازمت حاصل کرنے کے بجائے علاقے کے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے مشن کو اختیار کر لیا، اس کا ''ہمالیہ سکول و کالج'' اس کے ہمالیہ جتنے بلند عزم کا آئینہ دار تھا۔

اس کی میت گھر پہنچی تو حفاظتی انتظامات کے لیے ضلعی انتظامیہ کا حکم نامہ بھی پہنچ گیا اور اس پر عمل درآمد کروانے والے اہلکار بھی! تعزیت کے لیے آنے والوں کو ''احتیاط اور فاصلہ'' کا اصول بتایا ہی نہیں لاگو بھی کروایا گیا۔ گھر کے کھلے سے صحن میں کرسیاں اسی ترتیب سے لگائی گئیں۔ اہلِ علاقہ اپنے محسن کی جنازہ میں شرکت کرنے کو حاضر تھے، حالانکہ لوگوں کو جنازہ میں شرکت سے روکا بھی گیا تھا، اس کے گھر کے صحن میں مکرر نمازِ جنازہ کے بعد اسے اس کی آخری منزل کی جانب روانہ کر دیا گیا۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

میت کو دفن ہوئے کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک مرتبہ پھر پولیس، انتظامیہ اور ایمبولینسز نے اس کے قصبے کا رخ کیا، بیوہ ابھی یتیم بچیوں کو دلاسا بھی نہ دے پائی تھی، اوران کے چہرے پر بہنے والے آنسو خشک بھی نہ کر پائی تھی کہ انہیں گھر سے باہر آنے کا حکم ملا۔ بیوہ کی عدت کے احکام کو پسِ پشت ڈال کر ایک کرخت ہاتھ نے انہیں ایمبولینس میں ڈالا اور قرنطینہ سنٹر پہنچادیا۔ بیرونِ شہر سے آنے والوں کو گھر میں نہیں رکھا جاسکتا۔

دل تو ویران ہو ہی چکا تھا، گھر کو بھی تالا لگ گیا تھا۔ لوگ حیرت سے منہ میں انگلی دبائے اس محسنِ علاقہ کی بیوہ اور بیٹیوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے، بوڑھے والدین بھی اسی قرنطینہ میں تھے، جہاں نہ بستر تھا نہ ضروریاتِ زندگی!! اور پھر یہ ویرانی اسی طرح باقی گھروں پر بھی چھا رہی تھی، اس کے بہن بھائیوں کو ایک ایک کر کے گھروں سے نکال کر قرنطینہ میں پہنچادیا گیا تھا، خاندان کے بزرگوں کو بھی، کوئی فالج کا مریض تھا تو کوئی دل کا مریض، اور انجو پلاسٹی کے بعد احتیاط کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا! اس کے رشتہ داروں کے گھر چھاپے مارے جارہے تھے، بالکل اسی طرح جیسے انہوں نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کے بہن بھائیوں کے بعد اس کے کزنز کے گھروں پر چھاپے مارے گئے، اور ہر گھر میں سے کچھ افراد کو لے گئے، اور کچھ کو چھوڑ دیا گیا، جہاں جانے والے بھی حیران تھے اور چھوٹ جانے والے بھی۔ تین دن کے اندر خاندان کے پینتیس افراد بشمول گیارہ بچوں کے جن میں ایک برس کے تین بچے بھی تھے۔ انہیں کچھ دن قرنطینہ میں رکھنے کے بعد چھوڑا گیا تو اسی گھر کے کئی اور افراد کو پکڑ کر قرنطینہ سینٹر میں پہنچادیا گیا، ''احتیاط اور فاصلے'' کا جو قانون لاگو کیا جارہا تھا، وہ سمجھ سے بالاتر تھا حالانکہ اس کے علاقے کو بھی سیل کیا جاچکا تھا، دکانیں بند کردی گئی تھیں۔

اسکے بیوی بچوں اور والدین کی رپورٹس ''کووِڈ ۱۹ پازیٹو'' آئی تھیں، سوائے ایک بیٹی کے جو باپ سے سب سے زیادہ قریب تھی۔ انہیں ہسپتال کے آئیسولیشن وارڈ'' میں منتقل کردیا گیا، جہاں دو ہفتے گزارنے کے بعد انہیں ڈسچارج کردیا گیا۔ انکی نیگیٹو رپورٹس آنے پر ہسپتال کا عملہ بھی خوش تھا، انہیں ڈسچارج کرنے کی باقاعدہ تقریب منعقد کی گئی، پھولوں کے گلدستے اور سرٹیفکیٹ اور مٹھائی دے کر سرکاری ایمبولینس میں رخصت کیا گیا، لیکن یہ کیا؟ ان کی ایمبولینس کا رخ گھر کی بجائے پولیس سٹیشن کی جانب موڑ دیا گیا۔ ابھی وہ اس کی وجہ بھی نہ جان پائے تھے، کہ بیوہ کے ہاتھ میں ایف آئی آر کی کاپی تھما دی گئی۔'' آپ کے خاندان کو کرونا کی وبا پھیلانے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے''۔ آپ نے جس میت کو ہارٹ فیل کی سرکاری ہسپتال کی مصدقہ رپورٹ دکھا کر علاقے میں داخل کیا ہے، وہ کورونا کا مریض تھا۔ آپ پر مقدمہ ہوگا، اب چاہیں تو گرفتاری سے نکلنے کے لئے اپنی ضمانت کروالیں۔ اور پھر اس کی بیوہ اور بیٹیاں، بوڑھے ماں اور باپ سر نیہوڑائے بیٹھے تھے، پولیس سٹیشن میں انہیں پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ پھولوں کے گلدستوں کی پتیاں مرجھا اور جھڑ رہی تھیں، اور یتیم بچیوں کے پھول سے چہرے کچھ اور کمھلا گئے تھے۔ پھر انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کی ضمانت کے مچلکے کس نے بھرے، خاندان کے سارے مرد تو مختلف قرنطینہ سنٹرز میں قید بھگت رہے تھے، اس کا انتظام بھی تھانے والوں نے اپنے ''اختیار'' کی بنا پر کیا تھا۔

اس پکڑ دھکڑ میں خاندان کے ایک سو سے زائد افراد کرونا ٹیسٹ کے مراحل سے گزارے گئے تھے، اور پازیٹیو، نیگیٹو رزلٹ سے بالاتر سب سے ایک سا جابرانہ سلوک ہو رہا تھا، ایک سو تین میں سے دو افراد کے رزلٹ پازیٹو آئے تھے، اور اٹھہتر کے نیگیٹو! باقی ماندہ کی رپورٹس ان تک پہنچنے سے پہلے ہی گم ہوگئی تھیں، ٹیسٹ پر ٹیسٹ لئے اور لیبارٹری بھیجے جارہے تھے، مگر ہر بار کوئی انجانا ہاتھ انہیں اچک کر غائب کر رہا تھا۔

اس کے پر امن سرسبز و شاداب، لہلاتے ہوئے قصبے پر ان دیکھی اور انجانی وبا نے ڈیرے ڈال دیے تھے، یا وبا کی آڑ میں انسان انسان سے دشمنی نکال رہا تھا! وہ جو کامیاب اور ناکام بچوں کے رزلٹ بنانے کی الجھن میں ''نانی کے گھر'' تک گیا تھا، ایک مہینے کے اندر ہی دنیا اتنی بدل گئی تھی کہ اب اس علاقے کے بچے بھی ''رزلٹ'' کے نام پر فرسٹ سیکنڈ پوزیشن کا نہیں پوچھتے بلکہ بے اختیار ''کورونا پازیٹو'' اور ''کورونا نیگیٹو'' کا سوال کرتے ہیں اور ہر جانب قرنطینہ کا شیڈول ہی زیرِ بحث رہتا ہے۔☆

عالیہ حمید

ستارہ

دور سے اس نے دیکھا وہ بالکل اس کے بابا جان جیسے دکھائی دے رہے تھے۔اس نے ذرا قریب جا کر دیکھا تو وہ واقعی اس کے بابا جان ہی تھے۔

وہی سفید لباس مسکراتی آنکھیں۔

اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔وہ تو یہی سمجھتا رہا کہ بابا جان فوت ہو گئے ہیں۔مگر وہ تو زندہ ہیں اور شکر ہے کہ وہ لوٹ آئے ہیں زندگی میں بہار دوبارہ آئے گی اب میں ان کی خوب خدمت کروں گا کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔آہا.....کتنا مزا آئے گا ان کے ساتھ۔

وہ وسیع وعریض چھت پر دوسری طرف منڈیر کے پاس کھڑے تھے۔وہ خوشی سے ان کی طرف لپکا تھا.....مگر چند قدم دور ہی رک گیا۔ محبت والہانہ تھی مگر احترام بھیے حد تھا، اسی حجاب نے روک دیا حالانکہ اتنے دنوں بعد ان سے ملاقات کے بعد اس کا دل چاہا تھا کہ دونوں بانہوں میں بھینچ لے ان کو اور پوچھے کہاں چلے گئے تھے میں بے حد اداس ہو گیا تھا۔

وہ بھی اس کی اس والہانہ تڑپ کو سمجھ گئے اور مسکرانے لگے۔

''سنو بیٹا.....'' کتنی صدیوں بعد اس نے شفقت میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ سنے تھے۔

''سٹور والے چوک میں صدیق کا گھر قبرستان جانے والی گلی میں ہے؛ دروازہ پرانی لکڑی کا ہے وہ لوگ کافی پریشان ہیں ان کی مدد کر دینا.....'' وہ ابھی ان کی محبت بھری پکار کے حصار میں تھا کہ انہوں نے حکم صادر کر دیا۔

''چو چو چر چر چوں چوں.....'' یہ تھی بالکونی میں لگے ہوئے پنکھے پر بیٹھنے والی ننھی چڑیا؛ نماز فجر کے بعد کی نیند سے بیدار کرنے والی.

ایک تو اس چڑیا کی چہچہاہٹ اور دوسرا سورج کی گرم کرنیں جو پاؤں کی طرف والی کھڑکی میں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔آنکھوں کی پتلیوں میں لرزش پیدا ہوئی اور وہ دھیرے سے وا ہو گئیں۔

ہائیں.....سامنے وہی ڈریسنگ ٹیبل۔کمر کے پیچھے کی طرف والی پردہ پڑی ہوئی کھڑکی جس کے آئینے میں سے دکھائی دے رہی تھی۔سائیڈ ٹیبل پر رات مطالعہ کی جانے والی کتاب ادھ کھلی پڑی تھی۔وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور انہیں تلاش کرنے لگا۔دل کی دھڑکن کی جگہ بابا بابا کی آواز آ رہی تھی۔

''بابا کہاں چلے گئے ابھی تو آپ ادھر ہی تھے''۔

اس نے انتہائی وحشت کے ساتھ ادھر ادھر انہیں تلاش کیا جیسے کوئی بہت ہی محبوب چیز کھو گئی ہو۔اسے محسوس ہوا کہ اس کے پرسکون دنیا میں کسی نے ہنگامہ برپا کر دیا ہو۔چند لمحوں کے بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اسے سمجھ آئی کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا ایک بہت حسین خواب ''بابا جان''۔

''اوہ ہو.....چڑیا نے مجھے جگا دیا کاش میں کچھ دیر اور سویا رہتا کچھ دیر اور بابا سے باتیں کرتا''۔

اس نے سوچا اور غصے سے سورج کی کرنوں کو گھورا.....آہ.....مگر اس میں چڑیا اور سورج کی کرنوں کا کیا قصور؟ ہر رات کو ڈھلنا ہوتا ہے ہر خواب سے بیدار ہونا پڑتا ہے۔اس نے اداسی سے سوچا تھا۔

امتنان اوائل عمری میں ہی خواب دیکھتا تھا۔اکثر گھر والوں سے کہتا آج میں نے یہ خواب دیکھا، آج میں نے فلاں خواب دیکھا، مگر گھر والے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے تھے اسے بچپن کی معصومیت

سمجھ کر ٹالتے رہتے تھے۔تقریباً کوئی 12 سال کی عمر کا تھا جب ایک دن اس نے اپنی دادی جان سے کہا''دادی جان میں نے رات آپ کو خواب میں دیکھا آپ ننھیال میں نانا ابو کے گھر کے عین سامنے والے گھر کی سیڑھی پر بیٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں؛ دیکھو ناں سب جوان چلے گئے ہیں اور ہم بوڑھے ابھی ادھر ہی بیٹھے ہیں''۔

''ہی ہی ہی.....ارے کہاں چلے گئے سب جوان.....میرے بچے کو آج پھر کوئی خواب آیا ہے۔ننھیال جانے کو دل ہے میرے بیٹے کا؟ ہوں ں ں.....اب سمجھی میں'' دادی نے لاڈ سے کھینچ کر گود میں بٹھالیا۔

لیکن اگلے دن صبح دس بجے یہ ہنسی آنسو میں تبدیل ہوگئی جب انہیں خبر ملی کہ امتنان کے نانا کے سامنے والے گھر کا 13 سالہ بیٹا موٹر سائیکل حادثے میں جاں بحق ہوگیا اور انہیں واقعی ننھیال جانا پڑا۔اور بس یہی نہیں کچھ دنوں کے بعد اسی محلے کا ایک بہت امیر گھرانے کا اکلوتا بیٹا جسے لوگوں نے ہمیشہ چمچماتی نت نئی کاروں میں آتے جاتے دیکھا تھا مگر انتہائی سلجھا ہوا سب کے کام آنے والا اپنی شادی کی رات گیس لیکیج ہونے کے باعث اپنی دلہن سمیت مر گیا۔

اس واقعے نے امتنان کو کافی عرصہ پریشان کیے رکھا۔گھر والے بھی اب اس کی خواب والی باتوں کو سنجیدہ لینے لگے تھے۔جب ذرا اور بڑا ہوا اس نے خوابوں کی تعبیر کے متعلق مختلف کتابیں خرید لیں اور ان کا مطالعہ کرتا رہتا۔جن خوابوں کا مطلب اسے سمجھ نہ آتا وہ تعبیروں والی کتابوں میں تلاش کرتا اور کافی حد تک اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ جو خواب آیا ہے اس کی کیا تعبیر ہوسکتی ہے۔ایک دن تو نا سمجھی میں اس نے ماں سے ڈانٹ بھی کھالی۔ہؤا یہ کہ پڑوس سے رقیہ خالہ آئے بیٹھی تھیں ان کا سراپا دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا کہ بچے کی آمد متوقع ہے، نہ موقع دیکھا نہ محل سیدھا کہہ دیا کہ رقیہ خالہ کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہونے والی ہے۔ماں کی آنکھوں میں حیرت اور رقیہ خالہ کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔

''تجھے کچھ عقل ہے یہ تیرے کرنے کی بات تھی کچھ خیال کیا ہوتا۔ایسی باتیں بڑوں کے بیچ میں نہیں کرتے کچھ شرم کچھ لحاظ کرتے ہیں'' ماں نے رقیہ خالہ کے جانے کے بعد خوب سنائیں۔

''اور پھر اوپر سے اسے بیٹی کا سنا دیا وہ پہلے ہی چار بیٹیوں کی وجہ سے پریشان ہے اور بیٹے کی امید کیے بیٹھی ہے.....'' ماں نے سرگوشی کی جو اس نے سن لی۔

''ارے ماں.....اب اس میں میرا کیا قصور ہے خالو جان کو خواب میں دیکھا مولیوں کا شاپر اٹھائے گھر میں گھس رہے تھے۔ مولیاں بیٹی پیدا ہونے کی علامت.....'' ہٹ یہاں سے اب کہ ماں نے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بھاگ کر نکل گیا۔

اور جب واقعی رقیہ خالہ کے ہاں پانچویں بیٹی کی پیدائش ہوئی تب سے رقیہ خالہ کی تیوری سے وہ گھبرانے لگا۔

اب کے تو پورے خاندان دوستوں رشتہ داروں اور کزنز میں وہ سچے خواب دیکھنے کے حوالے سے مشہور ہوگیا۔نٹ کھٹ سا امتنان والدین کا پہلوٹھی کا بیٹا اب پختہ شعور کی طرف بڑھ رہا تھا روپے پیسے کی کمی نہیں تھی والد کا کاروبار بہت اچھا تھا مگر وہ بگڑا ہوا بچہ نہیں تھا والد نے اپنی شفقت سے اور ماں نے اپنی محبت سے اچھی تربیت دی تھی۔

ایک خواب ایسا تھا جو اس نے اپنے والدین سے شیئر نہیں کیا تھا کہ باعث پریشانی نہ ہو۔جب پریشانی گزر گئی تب اس نے بتایا کہ خواب میں دیکھا سارے خاندان والے ایک ایسی جگہ سے گزر رہے ہیں جو گیلی اور نرم ہے اور جیسے جیسے آگے جاتے ہیں زمین اور زیادہ نرم اور کیچڑ زدہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ پاؤں اندر دھنسے لگتے ہیں۔چلنا دشوار ہوجاتا ہے۔ سارے لوگ اپنی جگہ پر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں مگر کچھ ہی دیر کے بعد زمین دوبارہ سخت ہونا شروع ہوجاتی ہے اور قدم رکھنے آسان ہوجاتے ہیں۔اس خواب کی تعبیر کچھ ایسے ہوئی کہ اس کے جواں سال ماموں جان انتہائی سخت بیمار ہوگئے یہاں تک کے چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے وینٹیلیٹر پر چلے گئے ان کے بچے چھوٹے اور معصوم تھے۔ماموں پر فالج زدہ کیفیت تھی، خاندان میں کافی ٹینشن تھی بلخصوص ماں کے آنسو نہ تھمتے۔نانا جان حیات تھے اور جوان بیٹے کی اس حالت پر انتہائی دکھی تھے۔مگر معجزہ ہوا۔خدا نے کرم کیا اور ماموں جان آہستہ آہستہ اپنی صحت کی

طرف لوٹ آئے اور خاندان بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

بہرحال اس نے سارے خواب ایسے نہیں دیکھے اچھے اور پرامید خواب بھی دیکھتا رہتا تھا۔ممانی کے یہاں بیٹے کی پیدائش سے پہلے اس نے دیکھا کہ ان کے گھر میں گلاب کا پھول کھلا ہے.....تایا زاد کو خواب میں دیکھا کہ وہ ہوا میں اونچا اڑ رہے ہیں انہیں بتا دیا کہ کوئی کامیابی ملنے والی ہے کچھ دنوں کے بعد ان کی سلیکشن ٹریننگ کے سلسلے میں امریکہ جانے والے ٹیچرز کے گروپ میں ہوگئی۔

وقت کے ساتھ وہ سمجھدار ہوگیا تھا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ سارے خواب قابل بیان نہیں ہوتے۔کچھ پریشان کن خواب ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو اگر بیان نہ کیا جائے تو انکی تعبیر سے بچا جاسکتا ہے جبکہ اچھے خواب بیان کرنے چاہئیں تاکہ ان کی تعبیر ہو جائے۔کبھی کبھی تو اپنے دوستوں اور کزنز کو تنگ کرنے کے لیے بھی خواب کی کہانی بنالیتا تھا جس کو تنگ کرنا ہوتا اسے کہہ دیتا ہاں بھائی صاحب میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ.....

بس پھر کیا تھا وہ بھائی صاحب اس کے آگے پیچھے ارے ارے کیا دیکھ لیا یار ارے کچھ تو بتاؤ۔خیریت تو ہے ناں۔

کچھ دوست احباب تو فرمائش کر کے کہتے کہ یار کوئی خواب تو دیکھو کوئی نوکری لگ جائے، باہر جانے کا پروگرام کامیاب ہو جائے..... امتحانات دیے ہوئے ہیں اچھا رزلٹ ہی دیکھ دو یار.....میرے نمبر زیادہ سے زیادہ ہونے چاہئیں.....کم نمبر دیکھے ناں تم نے تو پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔

کوئی دوست احباب منگنی شادی حتیٰ کہ بچوں کی فرمائش تک کر ڈالتے.....حد ہوگئی بھائی ان لوگوں نے تو اس کے خوابوں کو کسی ماہر دست شناس کی پیشینگوئیاں سمجھ لیا تھا۔اور کچھ احباب تو خواب نہ دیکھنے پر ناراضگی کی فضا بنا لیتے تھے.....بہرحال زندگی اسی طرح خوشی سے رواں دواں تھی اس نے اپنی تعلیم تقریباً مکمل کر لی تھی کہ ایک حادثہ ہوگیا اس کے بابا جان کو اچانک ہارٹ اٹیک نے آلیا اور ان کی موت ہوگئی۔

زندگی نے پھر ایسا پلٹا کھایا کہ وہی نٹ کھٹ سا امتنان بالکل خاموش اور سنجیدہ ہوگیا اسے اس بات کا دکھ تھا کہ سب کے خواب دیکھنے والے کو اپنے بابا جان کی موت کے متعلق کوئی خواب کیوں نہ آیا.....ابھی تو اس نے بابا جان کو ٹھیک طرح سے دیکھا بھی نہیں تھا ابھی تو اس نے ان سے بہت کچھ سیکھنا تھا اور وہ اتنی جلدی منہ موڑ کر چلے گئے اور پھر کوئی اشارہ بھی نہیں آیا.....اب اگر مجھے کوئی خواب آیا تو اچھا نہیں ہوگا وہ خود سے کہتا.....تعبیروں کی سب کتابیں بند کر کے الماری میں ڈال دیں خواب دیکھنے تو نہ چھوٹ سکتے تھے مگر تعبیریں دیکھنی چھوڑ دیں،تعبیریں بتانا چھوڑ دیں.....کبھی کبھی وہ سوچتا کہ خواب آتا بھی تو کیا وہ اپنے بابا جان کو روک لیتا...ہماری زندگی ہماری موت ہمارے خواب ہماری حقیقتوں پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔

اس نے پڑھائی مکمل کی اور بابا جان کا کاروبار سنبھالنا شروع کر دیا۔

اور آج اس نے تین سال کے بعد خواب میں اپنے بابا جان کو دیکھا تھا۔

''سنو بیٹا''.....وہ ایک ایک لفظ یاد کر رہا تھا۔

''سٹور والے چوک میں.....''

''صدیق کا گھر قبرستان جانے والی گلی''۔

''دروازہ پرانی لکڑی کا.....''

''مدد کرو.....''

''آپ کے حکم پر سب کچھ قربان بابا جان مگر کیا یہ حقیقت ہے کہ وہاں پر کوئی صدیق صاحب واقعی پریشان ہیں۔وہ سوچ رہا تھا کہ اس خواب کی حقیقت کیا ہوسکتی ہے.....اور وہ کسی صدیق صاحب کو جانتا بھی نہیں تھا۔اس لیے کہ اس نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اسکول کالجز میں ہی گزارا تھا گاؤں کے لوگوں سے اتنی شناسائی نہیں تھی''۔

ایسے ہی کسی کے گھر جا کر اس کو کہہ دینا کہ کیا آپ پریشان ہیں.....کچھ اچھا نہیں لگتا اور نا جانے یہ خواب سچا ہے یا یہ محض میری بابا جان سے محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ مجھے خواب میں دکھائی دیے۔

وہ دفعتاً اٹھا اور الماری میں سے تعبیروں والی کتاب نکالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا.....مگر پھر رک گیا۔الماری بند کر دی.....غسل کیا تیار ہوا سائیڈ ٹیبل سے والٹ نکالا جیب میں ڈالا اور سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے لاونج میں آ گیا۔پہلے اس نے سوچا کہ ماں سے یا کسی اور سے صدیق

صاحب کے بارے میں پوچھ لوں۔

''مگر خواب حقیقت میں کیسے بدلتے ہیں۔ یہ سوچ کر اس نے پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا''۔ ماں کو تھوڑی دیر کے بعد آنے کا کہہ کر گلی میں نکل گیا۔

''اسٹور والا چوک۔ ہاں وہ تو دوسرے محلے میں ہے''۔

یہ سوچ کر وہ سٹور والے چوک میں پہنچ گیا سامنے قبرستان جانے والی گلی تھی وہ اس گلی میں داخل ہو گیا اور دائیں بائیں گھروں کے دروازے غور سے دیکھنے لگا.....ایک دروازے کے سامنے رک کر اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کافی پرانی لکڑی کا دروازہ تھا۔

کافی دیر سوچنے اور حوصلہ مجتمع کرنے کے بعد اس نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ لمحوں کے بعد ایک ننگ دھڑنگ میلا کچیلا سا بچہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔

''جی.....''اس نے باریک ننھی سی آواز میں کہا۔

''اپنے ابو کو یا گھر کے کسی بڑے کو باہر بھیجو بیٹا.....''

مگر بچے کے پیچھے ہی ایک ادھیڑ عمر شخص بوسیدہ سے کپڑے پہنے باہر آیا۔

''السلام علیکم''فوری طور پر تو وہ یہی کہہ سکا۔

''وعلیکم سلام''.....اس نے بڑے خلوص کے ساتھ جواب دیا۔ اور خاموشی سے اس کے آنے کا مقصد اس کے چہرے پر تلاش کرنے لگا۔

''جی میں عبدالاحد صاحب کے گھر سے آیا ہوں ان کا بیٹا ہوں میں.....''فوری طور پر تو یہی کہہ سکا۔

''کچھ سوچنے کے بعد اس آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور بڑی گرم جوشی سے اس کو ملا اور دعائیں دینے لگا۔ وہ بڑے اچھے انسان تھے ہمیشہ محبت سے ملتے، تو غریب لوگ ہیں مدد امداد بھی کر دیا کرتے تھے اللہ ان کو جنت میں رکھے اور ان کا مقام بلند رکھے''۔

اپنے بابا کی پس پردہ کی جانے والی اس خیرات پر اس کے دل میں بابا کا مقام و مرتبہ اور بھی زیادہ ہو گیا: ان کی اس آدمی کے منہ سے تعریف سن کر اس کا دل بہت مطمئن ہو گیا۔

اب بابا کے حوالے سے اس کے لیے اس آدمی کی مدد کرنا آسان ہو گیا اس نے والٹ سے پیسے نکالے اور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ میں بابا جان کے نام پر اس امداد کو جاری رکھنا چاہتا ہوں.....آپ کی دعاؤں کی ضرورت رہے گی۔ مجھے اجازت دیجئے۔ اپنے جذبات کو اس آدمی سے چھپانے کے لیے اس نے فوراً منہ پھیرا اور واپس لوٹ آیا۔

اس آدمی نے ہاتھ میں نوٹ دیکھے تو دعائیں دینے لگا''۔

خدا کی قسم گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں اوپر سے بچہ بھی سخت بیمار ہے میں نے عبدالاحد صاحب کو ان حالات میں بہت یاد کیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے عبدالاحد صاحب کی جگہ ان کے بیٹے کو بھیج دیا''۔

''وہ کافی پریشان ہیں ان کی مدد کرو''۔ امتنان کے کانوں میں اس آدمی کی بجائے بابا جان کی آواز گونج رہی تھی۔

آفس سے واپس آنے کے بعد نماز عشاء کی ادائیگی اس نے صحن میں کی جہاں اسے چمکتے ہوئے ستارے دکھائی دے رہے تھے۔ بابا جان کے لیے بہت سے دعائیں کرنے کے بعد اس نے سب سے زیادہ روشن اور چمکتے ہوئے ستارے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابا.....پھر ملیں گے ناں؟''

☆.....☆.....☆

ماہنامہ بتول لاہور جون 2020ء

عشرت زاہد

منزل کے لیے دو گام چلوں

''ہائے اللہ دو بج چکے.....اور ابھی کام تو اتنے سارے باقی ہیں۔چلو بھئی سارہ،جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ''۔

سارہ نے اپنے آپ کو ڈانٹتے ہوئے خود کلامی کی۔آج بیسواں روزہ تھا اور اس کی ساس صاحبہ کو اعتکاف میں بیٹھنا تھا۔عصر کی اذان پر وہ اپنے کمرے میں چلی جائیں گی۔وہ لاؤنج کی ڈسٹنگ کرتے ہوئے ذرا دیر کو صوفے پر ٹک گئی اور اپنی آنکھیں موند لیں۔یہ اس کا اپنا انداز تھا کہ، جب بھی کچھ پلاننگ کرنی ہوتی تو آنکھ بند کر کے کچھ دیر پرسکون ہوتی پھر دل ہی دل میں سب کچھ طے کر لیتی۔پھر جب آنکھ کھولتی تو ساری فکر اور ٹینشن دور ہو چکی ہوتی۔اور دماغ میں بس آگے کیا کرنا ہے ان کاموں کی ترتیب ہوتی۔پھر بس جلدی جلدی ہاتھ چلتے اور کام بحسن و خوبی انجام پا چکا ہوتا۔

مگر آج یہ ایک دو منٹ بھی اس کے نصیب میں نہ تھے۔ساس (امی) کا فون بجنے لگا تھا۔

اس نے اپنی ساس کا کمرہ کل ہی جھاڑ پونچھ کر کے،اچھی طرح دھو لیا تھا۔دھلے ہوئے پردے بھی ٹانگ دیے تھے۔آج صرف بستر کی چادر بچھانی باقی تھی اور نیچے قالین پر چاندنی بچھائی تھی۔پھر نیا جانماز نکالا۔ان کی دعاؤں کی کتابیں تسبیح وغیرہ۔یہ چھوٹی موٹی چیزیں نکال کر اس نے چھوٹی سی میز پر ترتیب سے رکھ دی تھیں۔دو دن پہلے ہی ان کے سارے کپڑے استری کر کے الماری میں ٹانگ دیے تھے۔

ان سب کے علاوہ ایک عدد نوٹ پیڈ اور پین بھی رکھ دیا کہ اس انتظام کے باوجود امی کو کسی چیز کی ضرورت پڑی تو وہ اس پہ لکھ کر دے دیں گی۔ان کو ہر قسم کی پریشانی سے بچانے کے لیے سارا نے مکمل توجہ سے اپنا کام کر دیا تھا۔اس کے علاوہ ٹرالی کے نیچے کے حصے میں چینی دان،نمک دانی اور کالی مرچ دانی بھی رکھ دی تھی۔مبادا چائے میں ضرورت پڑے۔میٹھی ٹکیہ اور ان نمکو بھی بھی ایئر ٹائٹ ڈبوں میں بھر کر رکھ دیے تھے کہ رات میں،عبادت کے دوران بے وقت بھوک لگے تو کھا لیں گی۔

تمام انتظام مکمل کر کے اس نے اطمینان کی سانس لی اور تنقیدی نظر سے دیکھنے لگی۔پھر خود کو شاباشی دیتے ہوئے کہنے لگی،''واہ سارہ،بڑا ہی اچھا انتظام کیا ہے تم نے.....شاباش''اور مسکرا دی تھی۔

اس کمرے نکل کر گھر کا ایک بار پھر سے اچھی طرح سے جائزہ لیا۔اچھی طرح سے ہر کونے کی صفائی کی۔اب ڈسٹنگ کر ہی رہی تھی کہ امی کا فون بج اٹھا۔ثمرہ آپی کا فون آیا تھا۔

''السلام علیکم امی،آپ کی تیاری مکمل ہو گئی؟''

''جی،ثمرہ آپی یہ میں ہوں سارہ،امی واش روم میں ہیں۔نہا رہی ہیں۔جی،جی،ہو گئی ہے تیاری مکمل،الحمدللہ''۔

''اچھا ابھی ہم آ رہے ہیں۔دیکھتے ہیں کہ،کیا تیاری کی ہے۔اچھا ہاں امی صبح سحری میں دودھ کے ساتھ پسے ہوئے بادام لیتی ہیں۔یاد ہے نا؟وہ رکھ دیے؟''

''جی.....آپی۔بس وہی ایک کام باقی ہے ورنہ سب مکمل ہے''سارہ نے اپنے سر پر ایک چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

''لو اور سنو.....میں نے ابھی ایک ہی بات پوچھی،وہ بھی نامکمل۔پتا نہیں کیا کیا گڑبڑ کی ہو گی تم نے۔خیر میں آ رہی ہوں دیکھتی ہوں آ کر۔شیما بھی آئے گی''۔

سارہ روہانسی ہو گئی تھی۔صبح سے روزے میں اتنے سارے کام کر کے بری طرح تھک گئی تھی۔لاک ڈاؤن کی وجہ سے ماسی بھی نہیں آ

رہی تھی۔ اس لیے سارے کام خود کرنے پڑ رہے تھے اور باہر سے کچھ منگوانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے کچن کے بھی سارے کام خود کرنے ہوتے تھے۔ اس پر اس طرح کی طنزیہ گفتگو نے اس کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ اس نے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کو کس کر لپیٹی ہوئی کاونٹر تسبیح کی طرف دیکھا اور خود کو تنبیہ کی..... سارہ خاموش رہو..... منہ سے کچھ نہیں کہنا۔ الھم ذکرنی منه ما نسیت..... ''یا اللہ مجھے یاد دلا دیجیے گا، جو میں بھول جاؤں۔ ہاں اللہ جی، میں تو بہت کمزور عقل والی، بھولنے والی، بے بس انسان ہوں..... بار بار بھول جاتی ہوں''۔

یہ نسخہ اس کی امی نے بتایا تھا۔ کسی بھی مشکل وقت میں شیطان کی اکساہٹ سے بچنے کے لیے۔ خاص طور پر سسرال میں جب غصے میں کچھ کہنے، جواب دینے کا دل چاہے۔ تب اپنے غصے پر، نفس پر قابو پانے کے لیے یہ مجرب نسخہ بہت کام آتا تھا۔ سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں ملا کر، کس کر کوئی ٹیپ لگا دو یا ڈوری باندھ دو۔ اس سے جو ہر وقت بے چینی ہوتی ہے، وہ آپ کو ہر لمحے یاد دلاتی رہے گی۔ سارہ نے انگلیوں میں کاونٹر تسبیح پہنی ہوئی تھی۔

کنٹرول..... سارہ..... کنٹرول!

''جی ٹھیک ہے آپی آپ کب تک آئیں گی؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''ظاہر ہے عصر سے پہلے ہی آؤں گی۔ تاکہ امی سے ملاقات ہو جائے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ''۔

سارہ نے لاؤنج کا پھر ایک مرتبہ تنقیدی جائزہ لیا یہ سوچ کر کہ وہاں کی صفائی پر کوئی بات نہ ہو جائے۔ شکر ہے دونوں بچے ابھی سو رہے تھے۔ اس نے کچن کا رخ کیا۔ افطاری اور کھانے کا مینو اس نے سوچ لیا تھا کہ افطار ہلکا سا رکھنا ہے۔ صرف فروٹ چاٹ اور دہی پھلکیاں۔ ثمرہ باجی کے بچے بھی ہوں گے تو سموسے اور وان ٹون فرائے کر لے گی جو فریزر میں رکھے ہیں۔ کھانے میں چکن پلاؤ اور جو جلدی بن جاتا ہے وہ کچھ میٹھا بنا دوں گی۔ جیسے سویاں۔

ابھی کام شروع ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ امی نے آواز دے کر بلا لیا۔

''جی امی''۔

''ہاں سارہ، دیکھو پچھلی بار کی طرح روزانہ سحری میں ٹھنڈی برف چائے مت دیا کرنا۔ ایسے زہر مار کرنی پڑتی ہے کہ حلق سے ہی نہیں اترتی۔ اور ہاں۔ ذرا جلدی اٹھ کر سحری تیار کرنا۔ یہ نہ ہو کہ آخر وقت میں اٹھ کر الٹا سیدھا بنایا اور مجھے پکڑا دیا۔ میں سکون سے سحری کرنے کی عادی ہوں۔ پھر بلڈ پریشر کی دوائی بھی کھانی ہوتی ہے۔ فراز میری دوائیاں لے کر آیا تھا نا؟''

''جی امی۔ وہ دراز میں رکھی ہے''۔

اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟ اور فون کس کا تھا؟''

''ثمرہ آپی کا فون تھا۔ وہ اور شیما ابھی آ رہی ہیں''۔

''اچھا اچھا، دونوں آ رہی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ورنہ نگوڑ ماری ایسی سسرال ملی ہیں کہ، بچیوں کی صورتیں کئی کئی دن نظر نہیں آتیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ اعتکاف میں بیٹھنے سے پہلے مل بھی نہیں پاؤں گی۔ اچھا ہوا۔

سنو دونوں کو صرف افطار پر نہ ٹرخا دینا۔ ان کو اچھی طرح کھانا وغیرہ کھلا کر روانہ کرنا۔ ورنہ میں تو ہوں گی نہیں، اور بے چاری بچیاں بغیر کھانا کھائے ہی ماں کے گھر سے چلی جائیں گی''۔

''نہیں امی، میں نے مرغ پلاؤ کا مسالہ بنا لیا ہے۔ کھانا کھلا کر بھیجیں گے''۔

آخر سارہ کو لب کشائی کرنی ہی پڑی۔

''اچھا بی بی۔ بہت شکریہ تمہارا۔ مہربانی..... میکہ تو بیٹیوں کا مان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی آئیں تو کھا پی کر، خوش ہو کر جائیں۔ بس یہی خواہش ہے میری اور میں بیچاری کیا کہتی ہوں۔ لیکن نہیں بھئی۔ یہاں تو زبان ہی پکڑ لی جاتی ہے۔ خیر ہمارا تو اللہ ہی مالک ہے.....'' اور بھی بہت کچھ بڑبڑانے کی آواز آتی رہی تھی۔

''اتنی محنت کی تھی، اتنا اچھا کمرہ سیٹ کیا، اور ایک لفظ ستائش کا

نہیں، شکریہ، جزاک اللہ اتنا ہی کہہ دیتیں۔ یا بس سر پر ہاتھ رکھ کر کوئی دعا ہی دے دیتیں میرا دل کتنا خوش ہوتا، ساری تھکن مٹ جاتی مگر سارہ چپ چاپ کچن میں آ گئی اور حسب عادت خود کلامی کی ''میں تو روزے سے ہوں'' پھر جلدی جلدی کام نمٹاتی رہی۔ تاکہ اپنا حلیہ بھی درست کر لے۔

اس کو فراز پر غصہ آنے لگا تھا اور کیسے مزے سے لمبی تان کر سو رہے ہیں۔ حالانکہ جب صحن دھل رہا تھا تو بچوں نے بیچ بیچ میں آ کر اس کو عاجز کر دیا تھا کہ ان کو پانی سے کھیلنے میں مزہ آ رہا تھا، تب فراز نے ہی زبردستی پکڑ کر سلایا تھا۔

اس نے آہستہ سے بیڈ روم میں جھانکا تو دونوں بچوں کے ساتھ فراز آرام سے سو رہے تھے۔ وہ اٹھانے کے لیے آگے بڑھ ہی رہی تھی، کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس وقت کسی کا فون اٹھانے کا قطعی ارادہ نہیں تھا کیونکہ وقت کم تھا اور کام بہت زیادہ تھے۔ مگر امی کا نام دیکھ کر جلدی سے فون کان پر لگا کر کچن میں آ گئی اور بات کرتے ہوئے پھل دھو کر، کاٹنے کے لیے کٹنگ بورڈ پر رکھ دیے۔ پھر کچن میں رکھے ہوئے اسٹول پر ہی ستانے کو بیٹھ گئی۔

''جی امی میں الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں''۔

یہ کہتے ہوئے نہ جانے کیوں آواز بھرا گئی تھی۔ ''بیٹا تمہاری ساس سے بات کرنی تھی۔ آج اعتکاف میں بیٹھ رہی ہیں نا۔ میں ملنے تو نہیں آ سکی۔ لیکن فون پر مبارکباد دے دیتی ہوں اور پھر دعاؤں کا بھی کہہ دوں گی۔

اور یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ نزلہ تو نہیں ہوا ہے؟ اس موئے کرونا کی وجہ سے معمولی نزلہ کھانسی سے بھی خوف آنے لگا ہے''۔

چپ چاپ سنتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

''جی امی میں ٹھیک ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ نزلہ نہیں ہوا''۔

''اچھا اچھا تو پھر میری بیٹی نے آج کام زیادہ کر لیا ہوگا۔ تھک گئی ہے نا، میری بیٹی! میں نے تمہیں بتایا تھا نا، جب بھی تھکن محسوس کرو تو تسبیح فاطمہ پڑھ لیا کرو۔ یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نسخہ ہے۔ جو آپ نے بی بی فاطمہ کو دیا تھا۔ اور تو کوئی گڑبڑ نہیں کی ہے نا؟'' وہ ماں ہی کیا جو بغیر بتائے نہ سمجھے۔

''ارے امی، جس کی آپ جیسی ماں ہو وہ گڑبڑ کیسے کر سکتی ہے؟ بس امی، تھکن ہو رہی ہے۔ ابھی ثمرہ آپی اور شیما بھی آ رہی ہیں امی سے ملنے کے لیے۔ اس لیے افطاری اور کھانا ساتھ ساتھ ہی بنا رہی ہوں''۔

''بہت اچھی بات ہے میری پیاری بیٹی۔ جتنی مہمانداری کرتے ہیں تو اپنے گھر میں برکت ہی ہوتی ہے۔ اور ہاں وہ وظیفہ یاد ہے نا؟''

سارہ نے اب مسکرا کر کہا، ''جی امی میں نے آپ کا وظیفہ بڑا بڑا خوبصورتی کے ساتھ لکھ کر لاؤنج کے دیوار پر ہی ٹانگ دیا ہے۔ تاکہ آتے جاتے نظر پڑتی رہے۔ اور اس کے پڑھتے ہی شیطان کی دسترس سے دور ہو جاؤں۔ یہ دیکھیں''۔

سارہ نے واٹس ایپ کال کو ویڈیو کال میں تبدیل کیا اور اپنی امی کو لاؤنج کی دیوار دکھائی۔ جس پر خوبصورت سی گلاس پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔

اللھم ذکرنی منه ما نسیت و علمنی منه ما جھلت

''شاباش میری بیٹی۔ چلو اب جلدی سے مسکرا دو اور اپنی ساس سے بات کرواؤ''۔

''جی امی، یہ لیجیے بات کیجیے''۔

اب اس کا موڈ کافی بہتر ہو چکا تھا۔ اس نے فراز کو آہستہ سے اٹھایا اور دونوں بہنوں کی آمد کا بتایا۔ اور خود نہانے چل دی۔ جب نہا کر واپس آئی تو حیرت سے اس کا منہ کھلا ہی رہ گیا۔ فراز نے فروٹ چاٹ بنا کر فریج میں رکھ دی تھی۔

اس نے تشکر بری نظر سے فراز کو دیکھا تو فراز نے آنکھیں بند کر کے، ایک ہاتھ دل پر اور ایک ہاتھ سر پہ لے جا کر کہا۔ ''آداب عرض ہے'' بس اس چھوٹی سی ادا سے ہی سارہ ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ اس نے دہی پھلکیاں بنا کر فریج میں رکھیں۔

اسی وقت اطلاعی گھنٹی بج اٹھی اور سارہ مسکرا کر دونوں نندوں کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھی۔

☆.....☆.....☆

سیر وسیاحت
آخری قسط

آمنہ راحت ۔ برطانیہ

ماضی کے دریچوں سے

س کو نیلی مسجد کہا جاتا ہے جس کی وجہ وہ نیلی ٹائلیں ہیں جو مسجد کی اندرونی دیوار پر لگائی گئی ہیں ۔ رات کے وقت یہ مسجد ان نیلی ٹائلوں کی روشنی میں نہا جاتی ہے۔ آج سے 400 سال قبل اس مقام پر بازنطینی بادشاہوں کے محلات تھے ۔ کھڑکیوں پر لگے رنگ برنگے شیشے ترک سلطان احمد کو وینس کے سلطان نے تحفتاً دیے تھے۔ مسجد کا سب سے اہم جزو ایک عظیم محراب ہے ۔ وہاں کے فانوسوں پر سونا اور دیگ جواہرات چڑھائے گئے ہیں ۔ مسجد کے مغربی حصہ میں بھاری بھرکم لوہے کی زنجیر لٹکائی گئی ہے۔ جہاں سے صرف سلطان گھوڑے پر بیٹھ کر اندر داخل ہوسکتا تھا۔ وہاں سے گزرتے وقت سلطان اپنا سر جھکا دیتے تھے تاکہ زنجیر سے ٹکر نہ ہو۔ یہ اس چیز کی علامت تھی کہ بادشاہ کا سر بھی عاجزی سے اللہ کے آگے ہی جھکتا ہے اور اللہ کے علاوہ اس کل کائنات کا کوئی مالک نہیں ۔ ہم چاروں قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کررہے تھے ۔ کئی لوگ جن کا تعلق امریکہ، چین، جاپان، برطانیہ اور دیگر ممالک سے تھا وہ بھی تعظیماً سر جھکائے کھڑے تھے ۔ جب ہم مسجد کی راہداری میں داخل ہوئے تو ہمیں لفافے پکڑائے گئے تاکہ ہم اپنے جوتوں کو اتار کر ان میں ڈال لیں اور پھر مسجد میں داخل ہوں ۔

مسلمان تھا یا غیر مسلم، مسجد کی عقیدت کے پیش نظر جوتے اتار کر لفافے میں ڈال کر، نظریں جھکائے اندر داخل ہؤا۔ مسجد اسلامی فن تعمیر کی خوبصورت مثال تھی ۔ دیواروں سے لے کر چھت تک، میناروں سے لے کر گنبد تک، کھڑکیوں اور دروازوں تک خوبصورت نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ آج سے 400 قبل، سلطنتِ عثمانیہ کے سلطان اس مسجد میں اللہ کے آگے سر جھکا دیتے تھے اور اپنی فتوحات پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے ۔ مردوں کے ساتھ ساتھ بائیں جانب سیڑھیاں چڑھ کر خواتین کے لیے بھی نماز پڑھنے کی جگہ بنائی گئی تھی ۔ مسجد سے نکلنے کے بعد ہم نے باہر لگے بینچ پر بیٹھ کر اپنے shoes پہنے جبکہ آصف اور میرا بیٹا حمزہ سڑھیاں اتر کر مسجد کے بیرونی حصے کا ویڈیو کلپ بنانے لگے ۔ نیلی مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر آیا صوفیہ موجود ہے۔ وہاں کھڑے ایک گائیڈ نے بتایا کہ اس میں جانے کے لیے ٹکٹ لینی پڑتی ہے اور اگر معاونت کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہے ۔ کیونکہ وہ انگریزی زبان سے واقفیت رکھنے کی بنا پر ہماری بہترین رہنمائی کرسکتا ہے ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آصف ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف روانہ ہوئے ۔

آیا صوفیہ

یہ قدیم یونانی عیسائی گرجا گھر ۵۳۷ (537 AD) میں تعمیر کیا گیا۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں اس کو مسجد میں تبدیل کردیا گیا اور اب اس کو عجائب گھر کا درجہ دیا گیا ہے ۔ یہ اس زمانے کی دنیا کی سب سے بڑی عمارت اور فنِ تعمیر کا بے مثل نمونہ تھی ۔ اس کو بازنطینی فنِ تعمیر کے نقطۂ عروج کا بھی شاہکار گردانا جاتا ہے ۔ اس کی اندرونی دیواروں اور فرش پر سنگِ مرمر لگایا گیا ہے ۔ سنگ مرمر سے ہی بنا ایک دروازہ اس کے جنوب میں بھی واقع ہے جس کے بارے میں یہ روایات مشہور ہیں کہ اس کے ایک جانب جنت ہے اور ایک جانب دوزخ ہے ۔ ایک اور دروازہ جس کو nice door کے نام سے جانا جاتا ہے وہ دوسری صدی قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کی دیواروں پر بادشاہوں اور ان کی زندگیوں کے بارے میں نقش ونگار بنائے گئے ہیں ۔ ۱۵۹۱ء سے ۲۶۳۹ء تک حکمرانی کرنے والے ترک سلطان مصطفیٰ اول جو کہ سلطان محمد سوم کے فرزند تھے ۔ ان کی قبر آیا صوفیہ کے برآمدہ میں موجود ہے ۔ ۱۱۰۷ء سے مئی ۱۲۰۵ء تک راج کرنے والے چوتھے کلیسا Enrico Dandolo بھی وہی مدفون ہیں ۔

تاریخ کے اوراق الٹاتے الٹاتے پیٹ میں بھوک سے مڑوڑ

اٹھنے لگے تھے۔ ہم نے دائیں بائیں ریستورانوں پر نظر دوڑانی شروع کی۔ اسی تلاش میں ہم اچانک ایک قدیم دروازے کی جانب جا نکلے۔ ارد گرد ترک قالینوں کی دکانیں تھیں اور دکاندار اپنے خاص انداز میں دکانوں سے باہر آ کر سیاحلوں کو اپنی دکانوں میں آنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ یہی انداز میں نے ترک ڈرامے Resurrection Ertugrul میں دکھائے جانے والے Sogut اور دیگر بازروں میں بھی دکھا تھا۔ ترک ثقافت کے رنگ چار سو نمایاں تھے۔ یہ استنبول کا ''آراستہ بازار'' تھا جس کی تعمیر سترھویں صدی میں ہوئی۔ یہاں 70 کے قریب دکانیں موجود ہیں اور یو مسجد سلطان احمد کے عقب میں واقع ہے۔ ۱۹۱۲ میں لگنے والی آگ کی وجہ سے یہ بازار بری طرح تباہ ہو گیا تھا۔ اور کھنڈرات کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں اس کی دوبارہ تعمیر کی گئی یہاں کئی قالین، جیولری اور برتنوں کی دکانیں ہیں۔ ہم نے وہاں ایک خاتون کو اپنے بچوں سے اردو میں بات کرتے سنا تو کافی انسیت محسوس ہوئی۔ ہم نے وہاں پر موجود ایک ریستوران کی فہرست طعام پر نگاہ دوڑائی اور ارادہ کیا کہ چاول یا روٹی کھائی جائے۔ ایک بار پھر زبان کا فرق حائل ہونے لگا۔ ریستوران میں کام کرنے والے ترک کے سامنے ہم جس چیز کا نام لیتے وہ ہر کسی پر ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ بظاہر اس کے پاس دنیا کا ہر پکوان موجود تھا۔ جب آصف نے اس سے پوچھا کہ یہاں کوئی ٹوائلٹ موجود ہے تو اس نے ہمیں اشاروں سے بائیں جانب جانے کو کہا اور ہم گلیوں سے گزرتے گزرتے کہیں کے کہیں جا پہنچے۔ راستوں سے نا آشنا ہونے کے باعث نہ ہی ہمیں ٹوائلٹ نظر آیا اور نہ ہی واپسی کا راستہ۔ کسی بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح جب ہم چاروں جانب جاتی گلیوں کو دیکھ کر واپسی کے راستے کا انتخاب کر رہے تھے کسینے ہمیں انگلش میں خوش آمدید کہا۔ ہم خوش قسمتی سے Blue Hotel کے سامنے موجود تھے۔ بمشل ''بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں'' ہم اپنے پیچھے موجود ریستوران سے بے خبر دائیں بائیں کھانے پینے کی جگہ تلاش کر رہے تھے۔

وہاں کے مالک نے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ ہم نے وہاں کے Menu کو دیکھا تو پکوان کی قسمیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ ایک ترک ریستوران ہے۔ سونے پر سہاگہ ان کے پاس ٹوائلٹ بھی موجود تھا۔ ہم سب باری باری فارغ ہوئے۔ ہاتھ دھو کر ہم نے پکوانوں کی فہرست پر تفصیلی نگاہ ڈالی۔ میں نے چکن wrap، آصف نے چکن Roast اور بچوں نے فرائیز کا انتخاب کیا۔ ہم جہاں بیٹھے تھے اس کے بالکل پیچھے دیوار کے ساتھ ستار موجود تھا۔ اسی اثناء میں ایک ترک اٹھا اور اس نے ستار پر دھنیں چھیڑ دیں۔ دیواروں پر بنے نقش و نگار سے لے کر تمام سجاوٹ قدیم ترک ثقافت کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔ انھوں نے ہمارے سامنے روایتی نان اور ایک حلوہ لا کر رکھا جس کو کھانے سے بھوک میں اضافہ ہوتا ہے۔ آصف کافی ہچکچا رہے تھے۔ مگر میں نے اور فارعہ نے اس کے دو تین نوالے لیے۔ یہ بہت ہی منفرد اور مزیدار حلوہ تھا۔ بعد ازاں انھوں نے ہمارے سامنے کھانا لا کر رکھا اور ہم دیوانہ وار اس پر ٹوٹ پڑے۔ چکن wrap لاجواب تھے میں نے وہاں سے قہوہ پینے کا ارادہ کیا۔ قہوہ کی بے شمار قسمیں موجود تھیں۔ مگر کیونکہ زبان کی رکاوٹ تھی تو انگلی رکھ رکھ کر جس قہوہ پر ہاتھ رکھتے وہ ہاں میں ہاں ملانے لگتا۔ اسی لیے مزید کوشش کرنے کے بجائے وہاں سے واپسی کا ارادہ کیا۔ چلتے چلتے ہم وہیں جا پہنچے جہاں دوپہر کو ٹیکسی ڈراور نے ہمیں اتارا تھا۔ ادھر دکان کے باہر فارعہ کو ایک کھلونا نظر آیا۔ اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر ہم اس دکان میں داخل ہو گئے وہاں سے میں نے ڈبے میں بند براؤنی اور ترک بکلاوے کا ڈبہ لیا۔ آصف نے ٹرکش ڈیلائٹ لی۔ ڈبوں پر بنی تصاویر دیکھ کر ہی منہ میں پانی آ رہا تھا۔ مگر ہم نے ارادہ کیا کہ ہوٹل میں پہنچ کر اس سے لطف اندوز ہوں گے۔

وہاں کھڑے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو روک کر واپسی کا کرایہ معلوم کیا تو اس نے 300 لیرا مانگے۔ ہم شکریہ ادا کر کے ایک اور کے پاس گئے تو اس نے لیرا بتانے کے بجائے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بغیر کسی چوں چرا کے چپ چاپ گھڑی میں جا بیٹھے۔ اس کے پاس موبائل میں گوگل ترجمہ کی ایپ تھی جس کے ذریعے وہ ہماری انگلش کو ترک زبان میں ترجمہ کرتا اور پھر اپنی ترک زبان ریکارڈ کر کے ہمارے سامنے رکھتا اور اس کا ترجمہ ہمیں دکھاتا جو ہم پڑھ لیتے۔ ہم نے اس کو بتایا کہ ہم اس سرنگ سے

نہیں جانا چاہتے اس کی وجہ سے گورنمنٹ 100 لیرا کاٹ لیتی ہے۔ اس نے بتایا کہ متبادل راستے پر بہت رش ہوتا ہے مگر ہماری ایک ہی التجا تھی چنانچہ وہ ہمیں طویل راستے پر لے گیا۔ وہاں تو گاڑی سے گاڑی جڑی ہوئی تھی ۔ بڑی بڑی بسیں ، ٹرالیں اور گاڑیاں بری طرح پھنسی ہوئی تھیں۔ آصف نے اس سے کہا کہ کسی اور راستہ سے لے جاؤ مگر وہ تو گاڑی ہلانے سے بھی قاصر تھا۔ غرضیکہ ہم ۲ گھنٹے گاڑی میں قید رہنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔ کچھ جگہ اس نے گاڑی کو دائیں بائیں سے اتنے خطرناک انداز سے نکالا کہ چیخ نکلتے نکلتے رکی۔ ایک بار تو اس نے پٹرول پمپ کو گاڑیاں اوورٹیک کرنے کے لیے استعمال کیا۔ وہاں کی ٹریفک انتہائی خطرناک اور تیز تھی مگر وہاں کے ڈرائیور بے حد ماہر تھے۔

اتنے میں ہم کو دور ایک پل نظر آیا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ پل استنبول کے یورپی حصے کو ایشیائی حصے سے جوڑتا ہے۔ یہ پل سمندر باسفورس کے اوپر بنایا گیا ہے۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس کا ویڈیو کلپ بنایا۔ سمندر میں بحری جہاز اور کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس سے اس جگہ کے بارے میں دریافت کیا جہاں مشہور ترک ڈرامے کی شوٹنگ ہوئی تھی اور اس نے بتایا کہ وہ Riva کے علاقے میں ہوئی ہے جو یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی ہوٹل کے سامنے روکی اور کیلکولیٹر پر 250 لکھ دیا آصف نے ادائیگی کی اور ہم بچوں کے ہمراہ گاڑی سے اتر آئے۔

ہوٹل کے کمرے میں آئے اور لذیذ براؤنی ، بکلاوے اور turkish delight سے لطف اندوز ہوئے۔ بعد ازاں ہم نے وہ تصاویر دیکھیں جو ہمارے کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کر لی تھیں۔ آج کے دن ہماری شادی کو پورے دس برس بیت چکے تھے مگر دن بھر کی مصروفیات میں ایک بار بھی اس موضوع پر بات نہ ہوئی، میں نے بھی آصف کے لیے ایک تحفہ خرید رکھا تھا جو میں چھپا کر بیگ میں آفس لے گئی تھی۔ فارعہ نے آصف کو آنکھیں بند کرنے کو کہا اور میں نے ان کو تحفہ تھما دیا۔ یہ شیشے کا بنا ہوا ایک ڈیکوریشن پیس تھا جس پر آصف کے لیے جملے درج تھے۔ ان کو تحفہ پسند آیا اور ہم نے اسے احتیاط سے بیگ میں سنبھال لیا تا کہ آصف واپس جا کر اپنی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سجا لیں۔ ماما اور بہن سے تو میری صبح ہی فون پر بات ہو گئی تھی البتہ رات کو بھائی کا مبارکباد کا فون آیا۔ آصف تو مستقل ہی اپنی امی سے رابطے میں تھے۔

بچے بیڈ پر لیٹتے ہی سو گئے اور ہم اگلے دن کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے لگے۔ ٹیکسی پر سفر نہ صرف بے حد مہنگا تھا بلکہ اس کے باعث ہمارے کم و بیش 3 سے 4 گھنٹے گاڑی میں ہی گزر گئے تھے۔ مختلف تجاویز پر غور کیا کہ اگر گاڑی کرائے پر لے لی جائے یا اگر ٹیکسی سے گزاری جائے کہ سرنگ اور رش والے علاقے کے بجائے کوئی تیسرا راستہ تلاش کر لے۔ سرسری طور پر ٹرین اور ٹرام بھی زیر بحث آئیں۔ ہم نے کئی میٹرو بسیں استنبول کی سڑکوں پر دوڑتی دیکھیں تو وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کی یاد آئی کیونکہ لاہور کا میٹرو بس منصوبہ ترکی کو دیکھ کر ہی شروع کیا گیا تھا، غرضیکہ کافی سوچ و چار کے بعد جگہ کا انتخاب تو کر لیا مگر ذرائع آمد و رفت کے بارے میں فیصلہ کئے بغیر ہی نیند کی آغوش میں جا پہنچے۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو طبیعت قدرے ہشاش بشاش تھی۔ اپنے گھر میں علی الصبح اٹھ جانے والے بچے آج دن چڑھے تک مزے سے سو رہے تھے۔ ناشتہ کے لیے آصف بیکری کا کافی سامان بیگ میں بھر کر لے آئے تھے۔ آج باہر بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا کے ساتھ بارش بھی برس رہی تھی۔ استنبول کا یہ علاقہ جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے قدرے پاڑی تھا۔ گاڑیاں اونچی نیچی سڑکوں پر دوڑ رہی تھیں۔ آصف نے اپنے کیمرے میں بالکونی سے مناظر محفوظ کیے ہی تھے کہ کمرے میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ سکیورٹی کے پیش نظر کمرے کے باہر یا ہوٹل کے بیرون میں تصویر کشی کی ممانعت ہے۔

کمرے کا دروازہ بجا تو سامنے room cleaning سے ترک خاتون کھڑی تھی۔ اس نے بھی ترک زبان میں ہم سے بات کرنے کی کوشش کی تو ہم ایک دوسرے کے چہرے دیکھنے لگے۔ آخر کار آج بھی اشاروں کنائیوں میں اس کو بتایا کہ ہم پانی ، صاف تولی اور صابن کی ضرورت ہے۔ اور درخواست کی کہ کوڑے دان کو تبدیل کر دیں۔ ہماری گفتگو

کے انداز سے بچے بھی محظوظ ہوتے۔ مثلاً تولیہ کے بارے میں بتانے کے لیے ہم تولیے پر ہاتھ رکھ کر کئی بار towel,towel کہتے جس کے جواب میں وہ ترک زبان میں تولیے کا مطلب بتاتی، پھر دروازے کی طرف اشارہ کر کے تولیہ لے جانے کو کہتے۔ وہ ہنس کر کہتی ''تمام تمام'' اور تولیہ اٹھالیتی۔ سمجھ پر یہ عقدہ اسی گفتگو کے دوران کھلا کہ ترک بھی صابن کو صابن ہی کہتے ہیں۔ چلو ایک چیز کے نام پر سب متفق تھے۔

نیچے لابی میں جا کر میں لاور بچے صوفوں پر جا بیٹھے جب کہ آصف استقبالیہ پر موجود عملے سے بات چیت میں مصروف ہو گئے۔ تقریباً 10 سے 15 منٹ کے انتظار کے بعد آصف نیآ کر بتایا کہ ہم یہاں سے ٹرین اسٹیشن جائیں گے۔ ٹیکسی دو منٹ میں آنے والی ہے۔ انھوں نے ہمیں وہ نقشہ بھی دکھایا جس سے ہمیں دورانِ سفر رہنمائی لینی تھی۔ ہم نے بذریعہ ٹرین ''ترسانے'' سے ''سیرکچی'' جانا تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ سے آصف نے وہ کارڈ بھی لے لیا تھا جسے ٹرین پر سفر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ابھی ہم بات چیت ہی کر رہے تھے کہ ٹیکسی نمبر ۳۲ ہوٹل کے سامنے آ کر رکی۔ آصف نے ٹیکسی ڈرائیور کو نقشے پر ترسانے دکھایا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ہم اب ٹرین اسٹیشن جا رہے تھے۔ تقریباً ۳۱ لیرا میں دس منٹ کے فاصلے پر ڈرائیور نے ہمیں ریل گاڑی کے اڈے پر پہنچا دیا۔ سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر گئے تو سامنے لگی مشینوں پر ایک خاتون اپنے اسی کارڈ کو scan کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آصف نے بھی ساتھ لگی مشین پر زور آزمائی شروع کر دی۔ اتنے میں ٹرین اسٹیشن پر تعینات عملے کا ایک فرد ہماری جانب بڑھا۔ اس نے خاتون سے کوئی بات کی جو یقیناً ترک زبان میں تھی کیونکہ وہ ہماری سمجھ سے باہر تھی اور وہ با آسانی سمجھ گئی۔ اب ہماری باری تھی۔ آصف انگلش میں سوال کرتے اور وہ ترک زبان میں جواب دیتا۔ کرتے کرتے یہاں بھی نوبت اشاروں تک آ گئی۔ ہوٹل سے باہر انٹرنیٹ کی سہولت موجود نہ تھی ورنہ گوگل کا سہارا لے لیتے۔ اس نے بڑی دیر بعد problem کا لفظ استعمال کیا۔ پھر وہ ایک اور مشین کے پاس ہمارا کارڈ لے کر گیا اور مشین پر ہاتھ زور زور سے مار کر کہنے لگا ''problem'' اسی اثنا میں ایک اور ترک بھی وہاں سے گزرا۔ اس نے بھی پولیس والے سے کوئی بات چیت کی اور جواباً اسے بائیں جانب اشارہ کر کے وہ ہماری جانب متوجہ ہوا۔ ہم نے جو حالات و واقعات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے، اسی شخص کے پیچھے جانے کا ارادہ کیا۔

ہم جہاں نکلے وہاں سے سیڑھیاں زیرِ زمین جا رہی تھیں۔ جس شخص کا پیچھا کرتے ہم یہاں تک آئے تھے وہ منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ اسی شش و پنج میں تھے کہ اتریں یا نہیں، ایک شخص سیڑھیوں کے پاس نظر آیا۔ آصف نے اس سے غیر یقینی آواز میں پوچھا۔ speak english اور اس نے کہا ''yes'' زبان کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ایسا ہوا کہ نہ پوچھیئے۔ خوشی کے مارے الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔ آصف نے اس سے کارڈ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ نیچے بھی کارڈ سکین کرنے کے لیے مشین موجود ہے، ادھر چلے جائیں۔ ہم بھاگم بھاگ نیچے جا پہنچے۔ اب مشین تو موجود تھی اور کام بھی کر رہی تھی مگر اس کو استعمال کیسے کریں؟ دائیں بائیں سبھی ترک تھے۔ اسی اثناء میں ایک لڑکی پاس آئی اور ہمیں پریشان دیکھ کر کہا ''i will help'' ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس نے ہمیں انگلش میں طریقہ بتایا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جس پر اس نے بتایا کہ ٹرین تک جانے کے لیے ہمیں یہاں سے برقی سیڑھیوں کی جانب جانا ہوگا۔ وہاں سے نکل کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو ایک ٹرین بائیں جانب سے آ رہی تھی اور ایک دائیں جانب سے وہاں بھی ٹرین اسٹیشنوں کے نام بورڈ پر درج تھے۔ مزے کی بات ہمیں ان ناموں کا تلفظ بھی نہ آتا تھا۔ بس ہجوں کی مدد سے اپنے نقشے میں تلاش کرتے تھے۔ ہمیں بار بار ''سرکجی'' کہتے۔ سن کر وہی لڑکی ہمارے پاس آ گئی اور اس نے بتایا کہ اسے ''سرک چی'' کہا جاتا ہے اور وہ بھی وہیں جا رہی ہے، بائیں جانب ٹرین آئے گی اور ہر دس منٹ کے بعد بائیں جانب سے ''جیبز ے'' کی جانب جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ استنبول میں تعلیم حاصل کرنے آئی ہے۔ ہم نے بھی اس کو بتایا کہ ہم سیاحت کی غرض سے برطانیہ سے آئے ہیں اور دراصل ہمارا تعلق پاکستان سے ہے۔ خیر اس کی مدد کا شکریہ پھر سے ادا کر کے ہم ٹرین پر سوار ہو گئے۔

ہم چاروں Pillars پکڑے کھڑے تھے کہ اتنے میں ایک چینی یا جاپانی جوڑے نے ایک جانب کھسک کر جگہ بنائی۔ ہم نے حمزہ کو وہاں بٹھا دیا۔ فارعہ کی بیحد منت کی مگر اس نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ ٹرین میں اعلانات بھی ترک زبان میں ہو رہے تھے۔ لہٰذا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم کس حد تک سمجھ پا رہے ہوں گے۔ آصف نے دیوار پر لگے نقشے کو دیکھ کر گن لیا تھا کہ کتنی بار گاڑی رکے گی تو ''سرک چی'' آئے گا۔ ایک اور سیٹ خالی ہوئی تو میں بھی بیٹھ گئی۔

اسٹیشن آتے، گاڑی رکتی، لوگ اترتے اور نئے چڑھ جاتے اور قافلہ رواں دواں ہو جاتا۔ اسی اثناء میں کسی ترک نے ستار پر دھن چھیڑ دی جس سے تمام مسافر لطف اندوز ہوتے رہے۔ ''سرک چی'' سے پچھلا اسٹاپ ''اسکودار'' تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے ریل گاڑی زیرِ زمین بلکہ سمندر میں سے گزرتی تھی۔ ٹرین سے نظر آنے والے نظارے اب دبیز دیواروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ آخر کار ''سرک چی'' کا اعلان ہوا اور ہم ٹرین سے باہر نکلے۔ یہ زیرِ زمین ٹرین اسٹیشن تھا۔ ایک کے بعد ایک برقی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بالآخر ہم کو سورج کی کرنیں نظر آئیں۔ ابھی بھی بادل اور سورج آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہوا رک چکی تھی مگر ہلکی پھلکی رم جھم ضرور جاری تھی۔ آج ہم نے استنبول کے ایک مشہور اور قدیم بازار "grand bazaar" جانے کا ارادہ کیا تھا اور سوچا تھا کہ اگر جلدی فراغت ہو جائے تو آج ہم شاید توپ کپی بھی ہو آئیں۔ جب ہم اسٹیشن سے باہر نکلے تو لوگ ریڑھیوں پر ترکی بیگل اور چھلیاں بیچ رہے تھے۔ ہر پندرہ بیس کے قدم کے بعد ہم راہ چلتے افراد سے بازار کا راستہ معلوم کرتے اور وہ کبھی دائیں، کبھی بائیں اور کبھی سیدھا چلنے کی تاکید کرتے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بازار اتنا دور ہو گا۔ بچے بھی تھک گئے تھے۔ فارعہ آصف کی گود میں تھی جبکہ حمزہ کو میں بمشکل کھینچ رہی تھی۔ ٹانگیں چل چل کر شل ہو چکی تھیں، پیاس بھی لگی ہوئی تھی مگر چار سو قالینوں، برتنوں، ثالوں، پرسوں اور کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ تقریباً ڈھائی میل چلنے کے بعد جس میں کئی بار 45 کی چڑھائی بھی آئی، ہمیں عظیم الشان دروازے نظر آئے جن پر ''grand bazaar'' لکھا تھا۔

عظیم بازار

ترک زبان میں buyuk carsi کہے جانے والے اس بازار کے لفظی معنی ''عظیم بازار'' کے ہیں۔ اس کو دنیا کا سب سے بڑا اور قدیم شاپنگ مال اور covered market کہا جاتا ہے۔ اس کا کل رقبہ کوئی پونے چار مربع میل ہے جس میں گلیاں اور چار ہزار دکانیں شامل ہیں۔ جب سلطنت عثمانیہ کے دور میں قسطنطنیہ فتح ہوا تو 56-1455 میں اس عظیم بازار کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ یہ بازار بیک وقت ایشیاء اور یورپ میں پھیلا ہوا تھا، اس لئے اس کو اوقیانوس کا تجارتی گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اس بازار کے چار گیٹ ہیں۔ شمال میں کتابیں ملتی ہیں، جنوب میں ٹوپیاں، مشرق میں جیولری کی دکانیں ہیں جبکہ مغرب میں کپڑے کی دکانیں۔

وہاں کے لوگ روایتی انداز میں دکانوں کے باہر کھڑے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ ترک زبان میں لوگوں کو اپنی اشیاء کی خصوصیات گنوا رہے تھے۔ ہم ایک دکان کے پاس رکے جہاں سے تازہ جوس مل رہا تھا۔ دکاندار نے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔ زیرِ زمین چھ سو سال قدیم اس کمرے کی دیواروں اور چھتوں پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ یہ اس زمانے کا مہمان خانہ تھا۔ اس نے ہمیں تازہ پھلوں کے شربت پیش کئے جو بہت لذیذ تھے۔ وہاں سے تازہ دم ہو کر ہم بائیں جانب والی گلی میں مڑ گئے۔ سر اٹھا کر دیکھا تو اوپر مہرابوں والی چھت نظر آئی اور سامنے لالٹین اور ہیرے جواہرات کے ساتھ ساتھ ان کے روایتی قالین لٹک رہے تھے۔ ہر کسی کی کوشش تھی کہ ہم ان کی دکان میں آ کر، ان کے سامان کو دیکھیں۔

ابھی ہم چل ہی رہے تھے کہ سامنے ایک شہزادہ اپنے شاہی لباس میں کھڑا نظر آیا۔ ہمیں اپنی طرف متوجہ دیکھتے وہ ہمارے پاس آ گیا اور اس نے ہمیں اپنے ہاتھ میں پکڑی البم دکھائی۔ جس میں بادشاہوں اور ملکہ کی تصاویر تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس وارترل اور کائی قبیلے کی تصاویر میں موجود ہیں۔ دراصل میں نے ماضی قریب میں ترک سیریل Resurrection Ertugrul دیکھی ہے جس میں سلطنت عثمانیہ اور مسلمانوں کی جدوجہد کے وہ نئے باب کھولے گئے ہیں جنہیں

تاریخ میں دلچسپی لینے والا کوئی باشعور مسلمان اپنے ذہن کے نقشے پر سے نہیں مٹا سکتا۔ میری بات سن کر اس نے مجھے کائی قبیلے کی تصاویر دکھائیں۔ یہ وہ قبیلہ تھا جس نے منگول، ہلاکو خان اور چنگیز خان کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسی کے سردار ارتل کے بیٹے عثمان غازی نے سلطنت عثمانیہ کا بیج بویا، جس کو ہم خلافت عثمانیہ کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ ہمیں اشارہ کر کے اپنے ساتھ ایک دکان میں لے گیا جہاں اس نے ہمیں روایتی کائی لباس نکال کر دکھائے۔

یہ دراصل ایک اسٹوڈیو تھا جہاں لوگ اس زمانے کا لباس زیب تن کر کے تیرھویں صدی میں لوٹ سکتے تھے اور اپنی تصاویر کھنچوا سکتے تھے۔ ہم سب نے کائی (Kayi) خاندان کا لباس پہنا، حمزہ نے عظیم جنگجو turgut کا کلہاڑا پکڑ کر تصویر کھنچوائی، جبکہ فارعہ نے ایک ننھی ہاتھون کا روپ دھار لیا۔ آصف نے قبیلے کے سرداروں کا لباس پہنا جبکہ میں نے ارترل کی بیوی حلیمہ سلطان کا حلیہ بنا لیا۔ پھر اپنی پسندیدہ تصاویر پرنٹ کروائیں۔ وہاں پر آصف ایک مٹھائی فروش کی دکان کے پاس کھڑے ہو کر turkish delight دیکھنے لگے تو دکاندار جلدی سے ہمارے لئے تازہ مٹھائی اٹھا لایا۔ ترک لوگ بے انتہا مہمان نواز ہیں اس کا اندازہ مجھے اس بازار میں ہوا۔ میں جس چیز کو دیکھتی دکاندار اپنے کام چھوڑ کر ہاتھ باندھے پاس کھڑے ہو کر مجھے یاس بھری نظروں سے دیکھتا کہ شاید کچھ پسند کر لوں۔ دل کی تابندہ مروتاً وہی ہر دکان سے کچھ نہ کچھ اٹھا لے۔ اتنے میں مجھے ایک دکان میں ایک پرس بہت خوبصورت لگا۔ آصف نے قیمت معلوم کرنا چاہی تو دکاندار نے پوچھا "Where from?"۔ میں نے جواب دیا۔ ''پاکستان''۔ یہ سننا تھا کہ وہ بے حد خوش ہوا اور کہنے لگا ''پاکستان کاردش'' یعنی پاکستانی ہمارے بھائی ہیں۔ اس نے کہا عام لوگوں کے لئے تین سو لیرا مگر آپ کے لئے دو سو لیرا۔ اس نے نیچے آنے کا کہا جہاں مزید پرس موجود تھے۔ ہم نے وہاں سے پرس خریدا۔ اکٹھ گلیاں گھومنا تو ناممکن تھا مگر کم از کم پندرہ بیس گلیاں تو پھر لی تھیں اور بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ ہم بازار کے دوسرے دروازے سے باہر نکلے اور دائیں بائیں کھانے کی جگہ ڈھونڈنے لگے۔ آصف نے کہا کہ انہوں نے بازار میں داخل ہوئے وقت برگر کنگ دیکھا تھا، آج وہاں سے کھاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے لوگوں سے پوچھ پوچھ کر ''سرک چی'' کا ٹرین اسٹیشن ڈھونڈا۔ جب واپسی پر پلیٹ فارم پر کھڑے اپنی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے تو ایک لمحے کو خیال آیا کہ کہیں غلط ٹرین پر نہ چڑھ جائیں لہٰذا ایک مسافر کے سامنے جب ''ترسانے'' کا نام لیا تو اس نے دائیں کے بجائیں بائیں جانب انتظار کرنے کو کہا۔ اگر اس مسافر سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید ہم ہوٹل پہنچنے کے بجائے استنبول کے دوسرے کنارے پر جا نکلتے۔ جب ٹرین آ کر رکی تو اس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ لوگ دروازوں سے لگ کر کھڑے تھے۔ بیٹھنا تو درکنار، اوپر چڑھنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی ہمیں اسٹیشن پر کھڑا دیکھ کر لوگوں نے سرک سرک کر ہمارے لئے جگہ بنائی اور ہمارے اندر آتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ فیملی ہے اور بچے بھی ہیں۔ انہوں نے ہمیں دروازے سے دور درمیان میں کھڑے ہونے کی جگہ دے دی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور بچوں کو بیٹھنے کو کہا۔ ایک اور شخص نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی اور میں فارعہ کو لے کر بیٹھ گئی۔ جب بھی کوئی کسی ماں، بچے یا بزرگ کو دیکھتا تو خود کھڑا ہو کر اس کو بٹھا دیتا۔ اخلاقیات اور نوجوانوں کی اتنی خوبصورت تربیت دیکھ کر دل عش عش کر رہا تھا۔ اعلانات مستقل ترک زبان میں ہونے کی وجہ سے کبھی ہم اسٹیشن کی تعداد گنتے اور کبھی نقشے میں سے نام سمجھتے۔ جب ہم ترسانے اترے تو اگلا مرحلہ ٹیکسی لینے کا تھا۔ ہم چلتے چلتے سڑک پر نکل آئے تو سامنے ایک جدید طرز کا شاپنگ مال تھا۔ وہاں جس ٹیکسی کو ہاتھ دیا اس نے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ خدا خدا کر کے ایک ٹیکسی ملی۔ ہم اس میں بیٹھے اور پھر کم و بیش تیس لیرا میں ہوٹل جا پہنچے۔ گزشتہ روز کے ٹیکسی کے کرایوں کی نسبتاً آج کا سفر زیادہ کم خرچ محسوس ہوا۔ وقت بھی کم ضائع ہوا، پیسے بھی اور ٹرین کے سفر سے مزہ بھی خوب آیا۔ رات کو میں نے سبز چائے بنا کر پی جس کا سامان کمرے میں ہی موجود تھا جبکہ آصف فرج سے نکال کر کولڈ ڈرنک پیتے رہے۔ بچوں کو سلا کر ہم نے تصاویر دیکھیں اور انٹرنیٹ پر اگلے مقام کی تلاش شروع کی۔ آج وقت کی کمی کے باعث توپ کپی میوزیم نہ جا سکے تھے لہٰذا اگلے دن وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔

اگلے روز سورج کی کرنیں جب پردوں میں سے چھن کر آنکھوں پر پڑیں تو سیاحت کی دلدادہ روح بے تابی سے جاگ جانے پر مجبور کرنے لگی۔ بچوں کو ناشہ کرایا۔ تیار کیا اور نتیجے لابی میں جا پہنچے۔ گزشتہ روز ککے حسین تجربہ کے بعد آج بھی ہم نے بذریعہ ٹرین جانے کا ارادہ کیا کیونکہ استنبول کے مناصر اور تاریخی مقامات گھومنے کا یہ آخری موقع تھا اور اگلے روز واپسی کی فلائٹ تھی۔ چنانچہ ہم آج کے دن کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتے تھے۔ استقبالیہ پر کھڑی ہوٹل کی انتظامیہ نے پلک جھپکتے میں ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ جو دس منٹ میں ہمیں ٹرین اسٹیشن چھوڑ آئی۔ پچھلے روز ہم سب نے 28 لیرا میں ریل گاڑی کا سفر کیا تھا جو کہ انگلینڈ کے صرف 4 پاؤنڈ بنتے ہیں۔ آج جگہوں کی واقفیت کی وجہ سے ہم با آسانی بی پلیٹ فارم پر جا پہنچے۔ آج اتوار تھا اور ٹرین میں رش قدرے کم تھا۔ اس لئے با آسانی ہمیں بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ ہم نے ترک نوجوانوں کی مروت اور حسن اخلاق کے کئی مظاہرے دیکھے۔ ایک ماں جو اپنے دو چھوٹے بچوں کے ہمراہ ایک اسٹاپ سے سوار ہوئی، دائیں بائیں اپنے بچوں کو بٹھانے کے لئے جگہ تلاش کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک نوجوان جو کتاب پڑھ رہا تھا، اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کو وہاں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بچہ اپنی ماں سے لے کر کچھ کھانے لگا تو اس سے کھانے کے کچھ ذرات زمین پر گر گئے جس کو وہ لفافے کی مدد سے سمیٹنے لگا۔ جب کچھ نہ بن پڑی تو ہاتھوں سے اٹھا کر صاف کر دیا۔ وہ نوجوان اب ٹرین سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھ کر کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک بزرگ خاتون اگلے اسٹاپ سے سوار ہوئیں تو ایک ادھیڑ عمر شخص اپنی نشست چھوڑ کر ان کو اپنی جگہ بٹھانے لگا۔ ادب، تعظیم اور احترام ترک لوگوں کی تربیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کئی بار میرا اور آصف کا دل چاہا کہ خود اٹھ کر ان کو جگہ دے دیں مگر ہماری گود میں بچے بیٹھے ہوئے تھے جو کسی طور پر کھڑے ہونے کو تیار نہ تھے۔

''سرک چی'' پہنچے تو زیر زمین ٹرین اسٹیشن میں چار پانچ برقی سیڑھیاں چڑھنا پڑیں۔ فارعہ اور حمزہ ان پر چڑھنے میں بہت ماہر ہو چکے تھے۔ ٹرین اسٹیشن سے اتر کر آصف نے اپنی اگلی منزل کے بارے میں رہنمائی لینا شروع کی۔ آج اسٹیشن سے نکل کر آپ بائیں ہاتھ مڑ جائیں تو سیدھی سڑک آپ کو اس چوک کی طرف لے جائے گی جہاں لگا عظیم گیٹ آپ کا استقبال کرے گا۔ ہم نے راستے میں ترک پکوانوں کی تصاویر ایک ریستوران کے باہر لگی دیکھیں۔ وہاں سے ترک پیزا جس کو Iahmacun بھی کہتے ہیں دستیاب تھا۔ ہم انگلینڈ میں بھی اس کو کھا چکے تھے لہٰذا یہاں بھی اسی کو کھانے کا دل للچانے لگا۔ یہ بہت ہی باریک اور لذیذ پیزا ہوتا ہے۔ وہاں کھڑے ریستوران کے منیجر نے ہمیں اندر آنے کا کہا۔ ہم نے اس کو واپس آنے کی یقین دہانی کرائی اور دائیں جانب اس گیٹ کی جانب مڑ گئے جس میں داخل ہوتے ہی سڑک 45 ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے سرسبز باغات میں جا نکلتی تھی۔ فارعہ اور حمزہ کے ساتھ اتنی چڑھائی چڑھنا کے ٹو سر کرنے کے مترادف تھا۔ جب ہم بالآخر سرسبز میدانوں میں پہنچے تو توپ کپی محل اور عجائب گھر کے مینار اور بارہ دریاں ہماری منتظر تھیں۔ لائن میں لگ کر اندر جانے کا ٹکٹ لیا جو کہ 72 لیرا کا تھا۔ دیواروں پر لکھے ہوئے اشعار پڑھتے اندر داخل ہوئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے کبھی سلطنت عثمانیہ کے سلطان آیا جایا کرتے تھے۔ دیوار تو دیوار، یہاں کی چھتوں تک ایسے حسین نقش و نگار بنائے گئے تھے کہ مسلم ثقافت کو داد دیئے بغیر نہ رہا جائے، کئی جگہ دیواروں پر اشعار کندہ کئے گئے تھے۔ کھڑکیوں پر رنگین شیشے لگے تھے اور باغ میں لگے پرانے درختوں کے تنے اپنی عمر کا پتہ دے رہے تھے۔

توپ کپی محل

یہ محل جس کو ترک زبان میں ''توپ کپوسرائے'' بھی کہا جاتا ہے، پندرھویں اور سولھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے سلاطین کی رہائش گاہ اور انتظامی صدر مقام تھا۔ اس کی تعمیر فاتح سلطان محمد نے فتوحات قسطنطنیہ کے چھ سال بعد 1459ء میں شروع کروائی۔ سلطان کے خاندان کی خواتین یہاں کے حرم میں رہا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ سلطان یہاں کے کاؤنسل ہال میں امرا کے ساتھ اہم ملاقاتیں بھی کیا کرتا تھا۔ جب 1923ء میں خلافت عثمانیہ کا اختتام ہوا تو اس محل کو عجائب گھر کا رتبہ دے دیا گیا۔ اس محل میں کئی سو کمرے موجود ہیں۔ ہم نے کچھ دیر باغ میں لگے

بینچ پر بیٹھ کر محل کا نظارہ کیا اور کیک کھائے۔ اس کے بعد ہم نے دائیں جانب سے محل کو گھومنا شروع کیا۔ پہلے برآمدے میں داخل ہونے کے لئے ''شاہی گیٹ'' (Imperial gate) سے گزرنا پڑتا ہے جس کو باب ہمایوں بھی کہا جاتا ہے۔ اونچی اونچی دیواروں میں گھرا پہلا برآمدہ (Cowrtyard) پارک کی چار دیواری کا کام کرتا ہے۔ یہاں کئی سیڑھیاں ہیں جو اوپر اور نیچے اترتی ہیں۔ کئی سو سال گزرنے کے باعث کئی زینے انتہائی خستہ حالی کا شکار ہیں۔ ہم جب سیڑھیاں اتر کر بائیں جانب مڑے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ٹھاٹھیں مارتا نیلگوں سمندر دائیں جانب موجود تھا۔ کئی سیاح سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ اتنا نیلے رنگ کا سمندر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کئی جہاز Containers لے کر شمال کا سفر کر رہے تھے اور بڑے بڑے بحری جہاز موجوں کو چیرتے آگے کو بڑھ رہے تھے۔ ہم جب ایک راہداری سے گزرے تو ایک عظیم دروازہ ہمارا منتظر تھا جس پر نقش ونگار اور دینی اذکار کندہ تھے۔ وہاں سلطان کا تخت اور بستر موجود تھا۔ اگلے کمرے میں اس زمانے کے ہیرے، جواہرات اور خواتین کے زیورات رکھے گئے تھے۔ دائیں جانب کاؤنسل ہال تھا جہاں اس دور کے نرم آرامدے صوفے بچھے تھے جہاں کبھی سلطان اپنے وزراء اور امراء سے مشاورت کیا کرتا تھا۔ وہاں کھڑے سکیورٹی گارڈ سے کہہ کر اپنی تصویر کھنچوائی اور باہر نکل آئے۔

کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے بارہ دری موجود ہے جس میں کبھی سلطان اور ملکہ فوارے سے لطف اندوز ہوتے ہونگے محل کے بائیں کنارے پر باورچی خانہ موجود ہے اور برتن رکھے گئے ہیں۔ کم وبیش پندرہ سے بیس ایسے کمرے موجود تھے جہاں کھانا پکایا جاتا تھا اور پیش کیا جاتا۔ موقع کی مناسب سے باورچی خانہ بھی مختلف ہوتا اور برتن بھی۔ وہ پیالیاں جن میں سلطان اور ان کے وزرا کافی اور ترک چائے پیتے تھے شیشے میں سجائی گئی تھیں۔ سامنے کمرے میں حمام موجود تھے۔ دائیں جانب کے کمروں میں ان کا جنگی ساز وسامان اور اسلحہ رکھا گیا تھا۔ یہ ہال اینٹوں اور پتھروں سے بنایا گیا تھا اور اس کے آٹھ ستون تھے۔ ساتویں صدی سے 1300ء تک کے استعمال ہونے والے تمام اسلحہ جات سے لیس یہ کمرہ ایسی تلواروں پر بھی مشتمل تھا جو اس قدر بڑی تھیں کہ دماغ اسی گتھی کو سلجھانے میں مصروف رہا کہ ایک شخص تن تنہا اس تلوار کو کیسے اٹھاتا ہوگا۔ وہاں ہم نے سلطان اورحان کی تلوار اور زرہ بھی دیکھی جو خلافت عثمانیہ کے بانی عثمان غازی کا فرزند تھا۔ وہاں ہم نے وہ لباس بھی دیکھے جو سلاطین اور جانثار مسلمان سپہ سالار جنگی مشن پر پہن کر جایا کرتے تھے۔ وہیں سے ایک دروازہ شاہی خزانے کی جانب کھلتا ہے جہاں ان کے زیورات اور جواہرات رکھے گئے ہیں۔

شاہی حرم چار سو کمروں پر مشتمل ہے۔ اس میں سلاطین کی مائیں، بیویاں، لونڈیاں، خادمائیں اور بچے رہائش پذیر تھے۔ وہیں سے ایک راستہ ان تعلیمی اداروں کی جانب جا نکلتا ہے جہاں سے ولی عہد اور شہزادے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بڑے داخلی دروازے سے داخل ہوتے ہی سلطان کی ماں کی رہائش گاہ آجاتی تھی۔ یہیں سے وہ راستہ نکالتا تھا جہاں سے شاہی باورچی کھانا لے کر محلات میں جایا کرتے تھے۔ مادر ملکہ کے یہ کمرے سولہویں صدی میں بنوائے گئے جب سلطان کے خاندان نے توپ کپی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں کی دیواروں پر نیلا، سفید پیلا اور ہرے رنگ کا سنگ مرمر اور پھولوں کے نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ اگلے کمرے میں حرم کے حمام اور غسل خانے ہیں، کچھ ہی فاصلے پر موجود عمارت میں سلطنت کا ولی عہد رہائش پذیر ہوا کرتا تھا۔ چوتھا Courtyard جس کو صوفہ ہمایوں بھی کہا جاتا ہے، اس میں وہ جگہ موجود تھی جہاں شاہی معلم اور شاہی طبیب رہا کرتے تھے۔ وہیں شاہی دواخانہ بھی موجود تھا جو سلطان محمد دوم کی دور کی یادگار ہے۔ یہیں ایک مسجد بھی موجود ہے جس کو صوفہ مسجد (Sofa Mosque) کہا جاتا ہے۔

ہم جب ''توپ کپی محل'' سے دائیں جانب مڑے تو ایک کمرہ ہمیں عجائب گھر میں لے گیا۔ یہ عجائب گھر اپنی نوعیت کا منفرد میوزیم تھا جس کی وجہ وہاں پر موجود وہ تاریخی نوادرات ہیں جن کا تعلق اسلامی تاریخ سے ہے۔ ایک بڑے ہال میں داخل ہوتے ہی سامنے خانہ کعبہ کی چابی موجود تھی۔ وہیں سے جب ہم بائیں جانب مڑے تو شیشے کے پیچھے حضرت داؤدؑ کی تلوار موجود تھی۔ اس کے ساتھ ہی حضرت موسیٰؑ کا وہ عصا

تھا جس کو انہوں نے زمین پر پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا اور سمندر بارہ حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ وہیں پر حضرت یوسفؑ (جن کو دنیا کے آدھ حسن سے نوازا گیا تھا) کا عمامہ موجود تھا۔ اس کے پاس ہی حضرت یحییٰ کے ہاتھ کی زرہ موجود تھی پاس ہی حضرت ابراہیمؑ کا برتن رکھا گیا تھا۔ سامنے والے کمرے میں گئے تو وہاں خلافت راشدہ کی یادگار رکھی گئی تھیں۔ ان کی وہ تلواریں موجود تھیں جن سے انہوں نے دوران غزوہ اسلام کلمہ حق بلند کیا تھا۔ وہیں پر حضرت خالد بن ولیدؓ کی ناقابل مات تلوار بھی تھی۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت حسینؓ کی قمیص اور حضرت محمدؐ کا پیالہ بھی موجود تھا۔ ساتھ والے کمرے میں قرآن پاک کا چار سو سال پرانا نسخہ رکھا گیا تھا اور ایک بزرگ خوبصورت آواز میں قرآن پاک کی مستقل تلاوت میں مشغول تھے۔ آصف نے بتایا کہ یہاں قرآن پاک کی تلاوت مستقل جاری رہتی ہے۔ قریب ہی ایک دیوار میں حضرت فاطمہؓ کی صندوقی موجود تھی اور ایک چھوٹے ڈبے میں حضرت محمدؐ کی داڑھی کے بال اور دندان مبارک موجود تھے۔ وہاں موجود اشیا کے باعث وہ کمرہ دنیا کا قیمتی ترین کمرہ محسوس ہو رہا تھا۔ ان سب چیزوں کو دیکھا تو بمشکل آنسو ضبط کئے کہ اللہ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ ان سب چیزوں کی زیارت کر سکوں۔

جب واپس کے لئے محل سے باہر نکلے تو اسی راستے پر چل نکلے جہاں سے ان باغات میں داخل ہوئے تھے۔ جب ہم بازاروں کے قریب پہنچے تو مجھے ایک مٹھائی کی دکان نظر آئی جس میں چاکلیٹ بکلاوا موجود تھا۔ وہاں کی مٹھائی اتنے دلنشین انداز میں سجائی گئی تھی کہ ہم سے وہاں گئے بغیر رہا نہ گیا۔ ہم نے وہاں سے ایک بکلاوے کا ڈبہ لیا اور چند قدم کے فاصلے پر اسی ترک ریستوران میں گئے جہاں ہم نے دکاندار کو واپسی پر آنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ اندر جا کر ہم باری باری ٹوائلٹ سے فارغ ہوئے اور کھانے کا آرڈر دیا۔ ہم نے وہاں سے Iahmacun، ترک چکن رول اور فرائز منگوائے وہاں کام کرنے والے ایک بیرے نے ہم سے ہمارے بارے میں دریافت کیا۔ جونہی اسے معلوم ہوا کہ ہم پاکستان سے ہیں اس نے بھی ہماری بہت آؤ بھگت کی۔ ترک لوگوں کی پاکستانیوں کے لیے محبت اور مہمان نوازی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب 1923ء میں سلطنت عثمانیہ اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی، برصغیر کے مسلمانوں نے خلافت کو پھر سے مستحکم کرنے کے لئے تحریک خلافت چلائی۔ گرچہ مسلمان اپنی جدوجہد میں کامیاب نہ ہو سکے مگر ترک مسلمانوں کے دل میں برصغیر کے مسلمانوں کے لئے احترام اور محبت ضرور پیدا ہو گئی۔ کھانا بے حد مزیدار تھا خاص طور پر Lahmacun بے حد خستہ اور لاجواب تھا۔ پیٹ تو بھر گیا مگر دل نہ بھرتا تھا۔ شکریہ ادا کر کے راستہ پوچھتے پوچھتے اشاروں کنائیوں سے باتیں سمجھتے اور سمجھاتے ٹرین اسٹیشن کے عقبی دروازے پر جا پہنچے اور واپسی کی ٹرین لی۔ ہمارے سامنے والی سیٹ پر ایک ترک میاں بیوی اور ان کے دو بچے بیٹھے تھے۔ بیٹا کوئی پانچ برس کا ہوگا اور کھیل کود میں مصروف تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے امی ابو کو بھی اپنے کھیل میں شامل کر لیتا اور چھوٹی بیٹی جو کم و بیش تین سال کی ہوگی پرام میں لیٹی تھی جس کو اس کی امی مستقل کچھ نہ کچھ کھلا رہی تھیں۔ میرے بچے بھی دلچسپی سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ فیملی سے پچھلے اسٹاپ پر اتر گئی۔ جب ہم ترسانے ریل اسٹیشن پہنچے تو اگلہ مرحلہ پھر سے ٹیکسی کی تلاش تھی۔ بالآخر ایک ٹیکسی والے نے ہمیں ہمارے ہوٹل Raddison Blue, Tuzla لے جانے کی حامی بھری اور تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے ہوٹل لے گیا۔ بھرپور دن گزارنے کے باوجود دل پر ایک اداسی طاری تھی جس کی وجہ تھی کہ پیر کو ہماری واپسی کی فلائٹ تھی۔

ہم نے کمرے میں جانے سے پہلے ہوٹل کی سیر کا ارادہ کیا جس کا موقع ہمیں گزشتہ دنوں میں مصروفیت کے باعث نہ مل پایا تھا۔ یہ عظیم الشان ہوٹل کئی سو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس میں کئی سوئمنگ پول، فوارے اور باغات تھے۔ وہاں پر ایک ریستوران بھی موجود تھا۔ چونکہ ہم روز ہی باہر سے کھانا کھا لیتے تھے چنانچہ یہاں کے پکوان چکھنے کا موقع میسر نہ آسکا۔ کمرے میں آئے تو سامان چار سو بکھرا ہوا تھا۔ کئی دن کی سیر، تھکان اور مصروفیت کے باعث سامان سمیٹنے کا موقع تو درکنار، ہوش بھی نہ آیا تھا۔ نمازوں سے فارغ ہو کر بچوں کو بستروں کی جانب روانہ کیا اور گرما گرم سبز چائے پی۔

اگلے دن ارادہ تو صبح جلدی اٹھنے کا تھا مگر آنکھ قدرے دیر سے

کھلی۔ بھاگم بھاگ ناشتہ کیا، سامان سمیٹا، بچوں کو تیار کیا اور ایک گھنٹے کے لئے نیچے ہوٹل میں موجود صوفوں پر جا بیٹھے۔ میں نے اور فارعہ نے ہوٹل کے adventure tour پر نکلنے کا ارادہ کیا اور ایک آبشار ڈھونڈ نکالی۔ یہ آبشار ہوٹل کی چار دیواری میں بنے صحن کے ایک تالاب سے نکلتی تھی جو ہوا میں معلق تھا اور زمینی تالاب میں گرتی تھی۔ پھر ہم نے آصف اور حمزہ کو اپنے ساتھ لیا اور ان کو بھی اس کا نظارہ کرایا۔ ہوٹل سے ہمیں 1 بجے ایئرپورٹ کے لئے نکلنا تھا۔ لہٰذا بارہ بجے واپس کمرے میں جانے کے لئے لفٹ کا بٹن دبایا مگر پہلے دن کی طرح لفٹ بند ہوگئی اور چار سو اندھیرا چھا گیا۔ جب موبائل کی روشنی میں لفٹ کے بٹن ٹٹولتے ہوئے الارم بجایا تو ساتھ ہی استقبالیہ پر کھڑے عملے کے فرد نے آکر لفٹ کی قید سے آزاد کیا۔ آصف نے دانستہ اپنے check out کو گھنٹہ تاخیر سے کروایا تھا۔ ککر خودکار نظام کے تحت 12 بجتے ہی کارڈ بے اثر ہوگیا۔ اس نے ہمیں نیا کارڈ دیا تاکہ ہم کمرے سے اپنا سامان لے آئیں۔

ہوائی اڈے پہنچے اور سامان جمع کروانے کی کوشش کی مگر وزن کی زیادتی کے باعث یہ ممکن نہ ہوسکا اور ہمیں تمام سامان ''ہینڈ کیری'' کرنا پڑا لیکن پھر جہاز کے عملے نے دروازے پر پہنچتے ہی ہم سے دو بیگ لے لیے تاکہ ہمیں جہاز کے کیبن میں سامان رکھنے میں مشکل درپیش نہ ہو۔ ایک بیگ جو ہمارے پاس رہ گیا تھا بآسانی کیبن میں پورا آ گیا۔ یہ دن کا سفر تھا اور بچے ماشاءاللہ تازہ دم تھے لہٰذا سارا راستہ کھیل کود میں مصروف رہے۔ جہاز برطانیہ کی فضائی حدود میں پہنچا تو تیز ہوا میں ہچکولے کھانے لگا۔ انگلینڈ میں deuis طوفان آیا ہوا تھا جس کی باقیات نے جہاز کے لینڈ کرنے میں کافی مشکلات پیدا کیں۔ میں فارعہ اور حمزہ کو سفر کی آیت پڑھاتی رہی۔ دلی دعا تھی کہ سب مسافر خیریت سے اپنے گھروں کو لوٹیں۔ کپتان کمال مہارت سے طوفانی ہواؤں میں جہاز کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیٹ بیلٹ کے نشان مستقل چل رہے تھے۔ بار بار اپنی سیٹوں پر بیٹھنے کے اعلانات ہو رہے تھے۔ جب جہاز نے خیریت سے زمین پر قدم رکھے تو مسافروں کی جان میں جان آئی اور ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ کاؤنٹرز پر واپسی کی مہر لگوا کر سامان بیلٹ سے لیا اور اپنی گاڑی کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ وہی meet and greet کا کار پارک تھا جہاں جمعرات کو گاڑی چھوڑ کر استنبول کو روانہ ہوئے تھے۔ ہماری گاڑی ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔

تقریباً چار گھنٹے کے سفر کے بعد ہم رات کے گیارہ بجے اپنے گھر پہنچے۔ بھوک زوروں پر تھی۔ آصف نے راستے سے ہی پیزا آرڈر کر دیا تھا جو ہم نے آتے ہی کھایا۔ سارے بیگ خالی کئے، بچوں کے دانت برش اور کپڑے تبدیل کیے۔ نمازیں پڑھیں اور کپڑے الماریوں میں رکھے۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ بستر اس وقت کسی عظیم نعمت سے کم نہ تھا چار دن سے گھر میں ہیٹر نہ چلنے کے باعث گھر قطب جنوبی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ آتے ہی سارے گھر کے ہیٹر چلائے۔ جب اگلے روز صبح بیدار ہوئے تو استنبول کی یاد شدت سے ستانے لگی۔ سورج بھی وہی تھا، آسمان بھی، ہم بھی وہی تھے مگر ترکی کی زمین بہت دور رہ گئی تھی۔

سلطنت عثمانیہ کے شہر استنبول میں گزارے گئے روز و شب ہماری یادرفتہ کی کتاب کا ایک حسین اور ہم باب بن چکے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اب قسمت اگلی مرتبہ ہماری آنکھوں کو کہاں کے مناظر دکھاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

پروفیسر خواجہ مسعود

سعودی عرب میں ایک سال

سعودی عرب میں ہم نے لگ بھگ ایک سال گزارا وہ اس طرح کہ ہم تین بار وزٹ ویزا پر وہاں گئے دو دفعہ تین تین ماہ اور تیسری دفعہ چھ ماہ کے لیے۔ اس دوران مختلف مقامات پر گئے بہت کچھ دیکھا اور سنا جس کی روداد دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ اسی لیے ''چمن بتول'' کی معرفت قارئین کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں۔ امید ہے وہ اسے پسند کریں گے۔

ہمارے بیٹے انجینئر ہیں۔ انہیں ان کے ڈیپارٹمنٹ نے پی ایچ ڈی کی تعلیم کے لیے کنگ فہد یونیورسٹی دہران (سعودی عرب) بھیجا۔ یہ سکالرشپ چار سال کے لیے تھا اس دوران ہم مختلف سالوں میں تین دفعہ ان کے پاس گئے اور خوب سیریں کیں۔

خُبر

پہلی دفعہ ہم 2009ء میں وہاں گئے۔ اُس وقت ان کی رہائش خُبر شہر میں تھی جو کہ دہران سے صرف پندرہ منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ اس لیے پہلے کچھ خُبر شہر کے بارے میں لکھوں گا۔ خُبر سعودی عرب کا ایک بہت بڑا اور بارونق شہر ہے اور ایک بہت بڑا تجارتی اور کاروباری مرکز۔ کھلی سڑکیں اور کشادہ گلیاں ہیں۔ ہر طرف رونق اور گہما گہمی ہوتی ہے۔ بڑے مصروف بازار ہیں۔ بلکہ اندرون شہر ایک بڑے بازار میں ہم گئے تو ایسے لگا جیسے لاہور کے کسی بارونق بازار میں پھر رہے ہیں۔ بے شمار پاکستانیوں کی دکانیں تھیں۔ بے شمار پاکستانی ریستوران بھی ہیں جہاں پاکستانی کھانے طرح طرح کے دستیاب ہیں۔ حتیٰ کہ ''وارث نہاری'' اور ''بندو پراٹھا کباب'' کے ریستوران بھی دیکھے۔ بلکہ ایک پشاور کے پٹھان بھائی نے تو وہاں ریستوران کھولا ہوا ہے جس پہ پشاوری چپل کباب ملتے ہیں۔ اس کے ریستوران میں بے تحاشا رش ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو سیٹوں کے لیے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ گرما گرم چپل کباب اور خستہ نان، کھا کے مزہ آجاتا تھا۔ بلکہ ہم نے دیکھا کہ کئی سعودی بھی آ کے شوق سے وہ چپل کباب کھاتے تھے۔ اُس وقت تو صرف چار ریال میں ایک کباب بمعہ دو عدد نان مل جاتے تھے۔

صبح کے وقت اُس بازار میں نکل جائیں تو مزے دار تازہ حلوہ پوری سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ نان چنے اور پائے بھی دستیاب ہوتے تھے اور مزے دار نہاری بھی۔

دوپہر کو اور رات کو بریانی بھی ملتی تھی۔ کئی جگہ بہترین مزیدار حلیم بھی دستیاب تھی۔ اور رات کے وقت تو ان ریستورانوں پر بے حد رونق ہوتی تھی۔ فیملیز کھانے کے لیے آجاتی تھیں۔ عربی ریستورانوں پر بھی مزیدار اور لذیذ کھانے ملتے تھے۔ خاص طور پر مستدی، رائس جن پہ چوتھائی روسٹ مرغ پڑا ہوتا تھا خوب مزہ دیتے تھے۔

بے شمار پاکستانی مٹھائی کی دکانیں بھی تھیں قصر شیریں، شیریں محل، ایمان ڈھاکہ سویٹ ہاؤس، قندفشاں وغیرہ جن پہ تمام پاکستانی مٹھائیاں دستیاب تھیں۔

دنیا کے تمام مشہور فوڈ برانڈز بھی تھے۔ میکڈونلڈ، ہارڈیز، کے ایف سی، کافی شاپس۔ سب رات گئے تک کھلے رہتے اور خوب رونق ہوتی۔ عرب لوگ بھی ان غیر ملکی ریستورانوں پہ بڑے شوق سے آتے تھے۔ عربی نوجوان لڑکے تو آدھی آدھی رات کو بھی ان ریستورانوں پر بیٹھ کر مزے سے کھا پی رہے ہوتے تھے۔

خُبر میں بے شمار مشہور اور بڑے بڑے میگا سٹور اور سپر سٹور بھی تھے۔ مثلاً کارفور، پانڈا، لولو، سما وغیرہ۔ یہ سٹور بھی رات گئے تک کھلے رہتے اور ہر وقت گاہکوں سے بھرے ہوئے اکثر ہم بچوں کی تفریح کی خاطر ان سٹورز پہ چلے جاتے تھے کیونکہ وہاں پلے لینڈ بھی ہوتی تھیں جہاں بچے خوب کھیلتے تھے اور اتنے مگن رہتے کہ بڑی مشکل سے انہیں

واپس گھر لے کے آتے۔

خلیج فارس کی ایک پتلی سٹرپ سعودی عرب کے اندر تک چلی جاتی ہے۔خُبر بھی اسی سمندری پٹی کے ساتھ آباد ہے اکثر ہم رات کو سمندر کنارے چلے جاتے جہاں بے شمار بڑے بڑے ہوٹل اور ریستوران تھے اور سمندر کے کنارے کنارے پارک بھی بنے ہوئے تھے۔رات کو وہاں موسم بھی خوشگوار ہوتا تھا اس لیے بے شمار پاکستانی،عربی فیملیز سیر کے لیے وہاں آجاتیں اور رات دیر تک وہاں موجود رہتیں۔کنگ فہد یونیورسٹی والوں نے بیچ کا ایک حصہ اپنے سٹاف کے لیے مختص کیا ہوا تھا جہاں ہم اکثر چلے جاتے۔ساحل پر پانی کم گہرا ہوتا تھا اس لیے بچے اور بڑے سب سمندر میں داخل ہو جاتے اور خوب نہاتے۔وہاں باربی کیو کا بندوبست بھی تھا اور ہم اپنے گھر سے بھی کھانے لے جاتے۔

یہاں سعودی عرب کے ایک حیرت انگیز کارنامے کا ذکر بھی کرتا چلوں۔سعودی عرب کے شہر خُبر سے بحرین قریباً پینتیس کلومیٹر دور ہے لیکن دونوں کے درمیان سمندر کا ایک ٹکڑا حائل ہے۔سعودی حکومت کا کارنامہ یہ ہے کہ سمندر کے اس ٹکڑے پر انہوں نے ایک زبردست پل بنا دیا ہے۔بڑا خوبصورت ہے،دورویہ کھلی سڑکیں ہیں۔لوگ بذریعہ کار آدھے گھنٹے میں سعودی عرب سے بحرین پہنچ جاتے ہیں۔

ہم بھی سیر کے لیے اس پل پر کئی دفعہ گئے۔جہاں سعودی عرب کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں بھی ایک شاندار ہوٹل اور ریستوران ہے اور پارک بنے ہوئے ہیں۔بالکل سامنے بحرین کی سرحد پہ بنا ہوا ہوٹل اور ریستوران نظر آتا ہے۔یہ بلاشبہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

خُبر میں پاکستان انٹرنیشنل سکول بھی ہے جو کہ وفاقی حکومت پاکستان کے ماتحت ہے۔وہاں ہزاروں پاکستانی بچے بچیاں پڑھتے ہیں۔نرسری سے لے کر ایف اے ایف ایس سی تک کلاسیں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کی الگ الگ۔لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سکول کی عمارت اندرون شہر نہایت معروف جگہ پہ ہے صبح اور دوپہر سکول کے اوقات میں وہاں بہت رش ہوتا ہے۔گاڑیاں پارک کرنے کے لیے جگہ بھی مشکل سے ملتی ہے۔ہمارے پوتا پوتی اسی سکول میں پرائمری حصہ میں زیر تعلیم تھے۔سکول میں تعلیم کا معیار بہت اعلیٰ ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ بلڈنگ شہر کے باہر کسی کھلی جگہ پہ منتقل کی جائے تاکہ بچوں اور ان کے والدین کو سہولت ہو۔

خُبر میں جس فلیٹ میں ہم رہتے تھے وہاں ساتھ ہی عرب اور افریقی گھرانے بھی رہتے تھے۔ان کے بچے تعداد میں کچھ زیادہ ہی ہوتے تھے،غالباً ہر فیملی میں کم از کم دو بیویاں تو ہوتی تھیں۔ہمارے گھر میں تو صرف دو بچے تھے لیکن رات کے وقت فلیٹ کے باہر کوریڈور میں بچوں کا ایک ہنگامہ برپا ہوتا تھا۔رمضان میں تو بچے ساری رات باہر کوریڈور میں کھیلتے رہتے تھے۔

خُبر میں جگہ جگہ بے شمار مساجد تھیں جو خوبصورت اور ایرکنڈیشنڈ تھیں۔ان میں نماز پڑھنے اور بیٹھنے کا مزہ آجاتا تھا۔میں اکثر نماز کے بعد بھی وہاں بیٹھا رہتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ قرآن پاک کے آخری سپارہ کی سترہ سورتیں میں نے وہاں ایک مسجد میں بیٹھ کر ہی حفظ کیں۔مساجد میں عربی بچے بھی بڑے شوق سے نماز پڑھنے آتے۔رمضان میں تو مساجد میں بے حد رونق ہوتی۔نہ صرف بچے آتے بلکہ خواتین کے لیے بھی مسجد کا ایک حصہ مختص کر دیا جاتا اور وہ بھی نماز تراویح پڑھنے باقاعدگی سے مساجد میں آتیں۔سعودی عرب میں سوائے حرمین شریف کے باقی سب مساجد میں آٹھ رکعت تراویح پڑھائی جاتی ہیں اور بچے نوجوان بڑے سب شوق سے تراویح کی نماز پڑھنے مساجد میں آتے ہیں۔

جمعہ کے دن بھی مساجد میں خوب رونق ہوتی۔نماز کے بعد مسجد کے باہر سبزیاں اور پھل بیچنے والے آجاتے اور ان سے سستے داموں سبزیاں اور پھل مل جاتے۔عید کے دن تو فجر کی نماز پہ اور عید کی نماز پہ مساجد میں بہت رونق ہوتی۔بچے سادے کپڑے پہن کر آتے۔خواتین بھی آتیں۔مسجد میں بچوں میں ٹافیاں وغیرہ تقسیم کی جاتیں اس لیے بچے بھی شوق سے عید کی نماز پڑھنے آجاتے۔

ریاض

سعودی دارالحکومت ریاض خُبر سے قریباً چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے وہاں ہمارا بھانجا ڈاکٹر تھا اور ایک سعودی ہسپتال میں کام کرتا تھا۔

ہم اکثر اس کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔لیکن ریاض کا ایک سفر مجھے ابھی تک خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ہؤا یوں کہ ایک دفعہ ہم ریاض جا رہے تھے اور اپنی کار میں سفر کر رہے تھے دن کا وقت تھا، راستے میں دوپہر ہو گئی۔سڑک دھوپ اور گرمی کی وجہ سے آگ کی طرح تپ رہی تھی۔اچانک وہی ہؤا جس کا ڈر تھا۔ اچانک کار کا ٹائر پھٹ گیا۔ بڑے زور کا دھماکہ ہؤا قدرت خدا کی کہ ہماری کار الٹی نہیں بلکہ آرام سے سڑک کے کنارے پہ ہو کے رک گئی یہ ہم پہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہؤا اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو بچایا وگرنہ اس طرح تو خوفناک حادثات ہو جاتے ہیں اور اکثر ہلاکتیں ہو جاتی ہیں۔دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ جانیں محفوظ رہیں حتیٰ کہ بچوں کو بھی معمولی خراشیں بھی نہیں آئیں۔میں اور بیٹا گاڑی سے باہر نکلے۔باہر آگ برس رہی تھی۔مشکل سے ہم نے گاڑی کا ٹائر بدلا اور اب آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے اگلے سروس سٹیشن تک پہنچے جو کہ کم از کم بیس پچیس کلومیٹر دور تھا۔شکر ہے خدا کا کہ وہاں تک بخیریت پہنچ گئے۔وہاں سے ایک نیا ٹائر خریدا اور پھر تازہ دم ہو کر ریاض کی جانب روانہ ہو گئے۔آئندہ کے لیے یہ سبق مل گیا کہ دن کے وقت سعودی سڑکوں پہ لمبا سفر نہیں کرنا چاہیے بلکہ رات کو یا صبح سویرے وہاں سفر کرنا محفوظ ہوتا ہے۔راستے میں ہم نے دیکھا جگہ جگہ گاڑیوں کے ٹائروں کے ڈھیر لگے تھے غالباً یہ انہی گاڑیوں کے ٹائر تھے جو ہماری طرح راستے میں اس طرح کے حادثات کا شکار ہوتی تھیں۔

خُبر سے دمام اور پھر دمام سے ریاض کی طرف جاتے ہیں لیکن ریاض تک سارا راستہ لق ودق صحرا دونوں طرف نظر آتا ہے۔کہیں سبزہ نظر نہیں آیا۔راستے میں جگہ جگہ لوگوں نے زمین کے بڑے بڑے قطعات خرید کر زراعت کی کوشش کی ہے لیکن پانی کی قلت اور سخت گرمی کی وجہ سے سبزہ کم ہی نظر آتا ہے۔ہر طرف سڑک کے دونوں کناروں پر ریت نظر آتی ہے بلکہ بعض اوقات توریت کے بگولے زوردار ہوا چلنے سے سڑک پر بھی آجاتے ہیں۔احتیاط سے ڈرائیونگ کرنا پڑتی ہے۔سعودی لوگ بہت تیز گاڑیاں چلاتے ہیں اور اکثر حادثات کا شکار ہوتے ہیں۔ہم نے وہاں سنا کہ سعودیوں کی موت زیادہ تر سڑک کے حادثات میں ہوتی ہے۔

بالآخر ہم بخیریت ریاض پہنچ گئے۔ریاض شہر بہت وسعت میں پھیلا ہؤا ہے اور وہاں کئی خروج (Exit) ہیں ہم بھانجے کے گھر جانے کے لیے خروج نمبر 9 سے شاہراہ سے نیچے ہو گئے گھر پہنچے۔اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور تازہ دم ہوئے۔

شام کے وقت بھانجے کے ساتھ ریاض کی سیر کو نکلے۔ریاض ایک خوبصورت ماڈرن شہر ہے۔وسیع سڑکیں، بڑی بڑی مارکیٹیں، میگا سٹورز، اونچی عمارات رات کے وقت سارا ریاض جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ریاض میں ایک بہت اونچا ٹوئن ٹاور (Twin tower) ہے جس کا نام غالباً ''برج الملک'' ہے۔اس کی ننانوے منزلیں ہیں۔ہم نے اس کی سیر کے لیے پچاس ریال فی کس کا ٹکٹ خریدا۔

پہلی منزل سے لفٹ پر بیٹھے۔میرا خیال تھا کہ بہت وقت لگے گا لیکن ہم ایک منٹ میں قریباً پچاسویں منزل پہ پہنچ گئے۔وہاں سے پھر دوسری لفٹ پہ بیٹھے وہ بھی قریباً ڈیڑھ منٹ میں ہمیں چوٹی پر لے گئی۔ وہاں دونوں ٹاورز کو ملانے کے لیے ایک پل سا بنایا گیا ہے۔جس پہ کھڑے ہو کر ہم نے سارے ریاض کا نظارہ کیا۔رات کے وقت عجب نظارہ تھا۔اوپر سے سارا شہر ایسے چمک رہا تھا جیسے سیاہ رات میں آسمان پر ستارے چمکتے ہیں۔وہاں چوٹی پر ایک چھوٹا سا ریستوران بھی تھا جہاں چائے، کافی، سنیکس اور کولڈ ڈرنکس مل رہی تھیں۔ہم نے بھی چائے لی اور چسکیاں لیتے ہوئے شہر کا اتنی بلندی سے نظارہ کرتے رہے۔

وہاں کی سیر کے بعد نیچے اترے۔ریاض شہر اتنا وسیع ہے کہ اسے پار کرتے ہوئے آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ کا وقت لگ جاتا ہے۔حالانکہ گرمی کا موسم تھا لیکن ریاض میں رات کو موسم خوشگوار تھا بلکہ ہم اے۔سی بند کر کے سوتے۔کھڑکیاں کھولیں تو ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی، ہمیں کھڑکی بھی بند کرنا پڑی۔

ہمارے بھانجے کی ایک ہی بیٹی ہے جو ریاض میں ''المنارہ'' سکول میں پڑھ رہی تھی۔یہ سعودی عرب کا مہنگا ترین سکول ہے۔ہمیں بتایا گیا کہ اس کی ماہانہ فیس اتنی ہی ہے جتنا وہ ماہانہ فلیٹ کا کرایہ دے رہے

تھے یعنی پچیس سو ریال ماہانہ۔ انہوں نے بتایا کہ اس سکول میں سارے اساتذہ وہ ہیں جن کے پاس یورپ کا پاسپورٹ ہے یا امریکہ کا..... اگر کوئی پاکستانی ٹیچر بھی ہے تو اس کے پاس لازمی یورپ کے کسی ملک کی نیشنلیٹی ہونی چاہیے۔ بہر حال سعودی لوگ جو امرا میں شامل ہیں اسی سکول میں بچوں کو تعلیم دلا رہے تھے۔ اُس وقت ریاض میں ایک خواتین کی یونیورسٹی بھی زیرِ تعمیر تھی جو کہ اب سعودی عرب کی ایک بہترین اور بڑی یونیورسٹی شمار ہوتی ہے۔ اُس کا نام عرب کی ایک شہزادی کے نام پر غالباً ''پرنس امینہ یونیورسٹی'' ہے۔

لیکن اب تو سنا ہے (بلکہ ہمارے وہاں ہوتے ہوئے ہی یہ یونیورسٹی شروع ہوگئی تھی) جدہ کے قریب ایک بہت بڑی یونیورسٹی بنائی گئی ہے جہاں ماڈرن ماحول ہے۔ وہاں یورپ کی طرح لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی ساحلِ سمندر کے پاس ہے۔ اس کا نام غالباً کاؤسٹ (Kaust) ہے یعنی کنگ عبد العزیز یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی۔ اس میں سٹاف کی تنخواہیں بھی بہت زیادہ ہیں اور طلبہ کو بھی اچھا سکالرشپ دیا جاتا ہے۔

ہم نے دو دن ریاض کی خوب سیر کی۔ ریاض بھی ایک بہت بڑا کاروباری اور تجارتی مرکز ہے۔ یہاں سعودی شیوخ کے بہت بڑے بڑے محلات ہیں۔ یہ ایک بین الاقوامی شہر بن گیا ہے۔ یہاں ساری دنیا سے لوگ آتے ہیں کیونکہ یہاں غیر مسلم بھی آسکتے ہیں۔

دو دن ریاض کی سیر کرنے کے بعد ہم واپس روانہ ہوئے لیکن اب ہمیں سبق مل چکا تھا اس لیے فجر کی نماز پڑھ کے ٹھنڈے ٹھنڈے واپسی کا سفر شروع کر دیا تا کہ تیز دھوپ نکلنے سے پہلے خُبر پہنچ جائیں۔ ریاض سے خُبر قریباً چار گھنٹے کا سفر ہے۔ سعودی ڈرائیور تو بہت تیز ڈرائیونگ کرتے ہیں کم از کم ڈیڑھ سو کلومیٹر فی گھنٹہ اس لیے وہ تین گھنٹے میں یہ سفر طے کر لیتے ہیں۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر فائقہ اویس۔الجبیل

بچوں کی تربیت، کچھ خیالات

تربیت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کو برتنا اور سہنا سکھایا جائے، اور زندگی میں صرف مثبت رویے ہی نہیں ہوتے

بچوں کی تربیت انسانی زندگی کے بڑے فرائض میں سے ایک ہے۔اس پر بہت کچھ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ کچھ باتیں ذاتی اور عملی تجربہ سے جو میں نے اخذ کی ہیں آپ کی نظر۔

میں ایک پیدائشی ماں ہوں، جذبات سے بھرپور۔لیکن عملی طور پر اکثر اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوں اور کبھی کبھی یہ کوشش ناکام بھی ہو جاتی ہے۔ایسا آپ کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔میں سمجھتی ہوں کہ بچوں کی تربیت کے لیے قرآن، حدیث، سیرت نبویؐ اور سیرت صحابہؓ سے استفادہ لازمی ہے۔ ساتھ بزرگوں اور دوستوں کے مشورے بھی مدنظر رکھنے چاہئیں۔قرآن اور حدیث پر صرف مسلمانوں کا ہی حق نہیں ہے۔ ہر انسان ان سے رہنمائی لے سکتا ہے اور لوگ لیتے بھی ہیں۔اگر اس طرح براہ راست نہیں تو اپنی اپنی مذہبی کتابوں اور اقدار سے تو لیتے ہی ہیں۔اسی لیے مذہبی لوگ عموماً عاجز، اور ان کے بچے متحمل مزاج کے ہوتے ہیں۔ اس کی مثالیں بھی ہیں، جیسے orthodox یہودی اور عیسائی۔ ہمارے ہاں بھی علما اور امام مسجد کے بچے ایسے ہی ملیں گے۔

بچے کی تربیت کا آغاز قرار حمل سے ہو جاتا ہے۔ ماں کی کیفیات اور جذبات اسی وقت سے بچے پر اثر انداز ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسے جیسے حمل آگے بڑھتا ہے، اور بچہ حرکت کرنا شروع کرتا ہے تو اس کے کچھ شواہد بھی ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جیسے باپ کی آواز پر بچے کا زیادہ حرکت کرنا۔اس موضوع پر سائنسی تحقیق بھی ہوئی ہے اور وہ اس کی تائید کرتی ہے۔اسی لیے جو خواتین حمل چاہ رہی ہوں، انہیں ذہنی تناؤ سے بچنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، کیونکہ یہ تناؤ حمل میں تاخیر کا سبب بن سکتا ہے۔کئی بیماریوں کا تعلق بچے کے رحم کے اندر گزارے گئے عرصے سے ہوتا ہے۔ دوران حمل ماں کی ذہنی اور جسمانی صحت کا بچے کی ذہنی اور جسمانی صحت سے گہرا تعلق ہے۔اسی لیے کہتے ہیں، صحتمند ماں، صحتمند بچہ۔اس لیے ہم دور جدید کی ساسوں کو اپنی بہوؤں کا ابھی سے خیال رکھنا شروع کر دینا چاہیے تاکہ وہ ایک صحتمند نسل کو جنم دیں۔اسی طرح بہوؤں کو بھی ہر منفی سوچ سے دور رہنا چاہئے تاکہ وہ صحتمند رہیں اور صحتمند بچے کو جنم دیں۔

بچے کو سکھانے کے لیے پہلے خود کو سکھانا ضروری ہے۔مثال کے طور پر آپ اس کو جھوٹ سے بچانا چاہتے ہیں تو خود کبھی جھوٹ نہ بولیں۔ آپ اسے غیبت سے بچانا چاہتے ہیں تو کبھی اس کے سامنے اور اس کی غیر موجودگی میں بھی کسی کی غیبت نہ کریں۔ غیر موجودگی کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ہر چیز ہماری کوشش پر منحصر نہیں ہوتی۔ جو بھی ہوتا ہے وہ اللہ کی توفیق اور رحمت سے ہوتا ہے۔ایک اچھی، تابع دار، نیک اور صالح اولاد کے لیے ہمیں ظاہری ہی نہیں باطنی نیکیوں کی بھی ضرورت ہے۔تربیت کے لیے مالی وسائل تو چاہیے نہیں ہوتے۔اس کے لیے تو صرف اپنی ذات کو خرچ کرنا پڑتا ہے۔اچھے بچے چاہئیں تو اس خرچ کے لیے تیار رہنا ضروری ہے۔ گناہوں سے بچاؤ ہمارے وقار میں بھی اضافہ کرے گا۔امام ابوحنیفہؒ نے گناہ چھوڑنے کے لیے یہی حکمت عملی اختیار کی تھی۔

بچہ آپ سے توجہ مانگتا ہے۔اسی لیے اس کی زندگی کے ابتدائی چالیس دن ماں سے قرآن، نماز اور شوہر کے ساتھ تعلق بھی معاف کر دیا گیا تاکہ وہ نئے آنے والے انسان کے ساتھ اپنے تعلق کو سمجھ سکے اور قائم کر سکے۔ بچے کی تربیت کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ بچے کے آنے سے پہلے ہی دو انسانوں کو ایک رشتے میں باندھ کر ان پر بہت سی ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ شادی سے پہلے کی زندگی کتنی آزاد ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات بلکہ اکثر

اوقات ان ذمہ داریوں کا رخ اور طرف موڑ دیا جاتا ہے۔

شروع کے سالوں ہی میں بچہ صفائی ستھرائی، دھیمے انداز میں بولنا، اچھے الفاظ کا استعمال سیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح روزمرہ زندگی کے آداب بھی بچے ساتھ ساتھ سیکھ لیتے ہیں۔ سکول جانے سے پہلے بچہ معاشرتی آداب سے کافی حد تک واقف ہو جاتا ہے، اگر سکول کی عمر پانچ سال ہو تو۔

ماں کے لیے ضروری ہے کہ حمل کے دوران وہ اپنی سوچوں کو مثبت رکھے، پیدائش کے بعد سوچ کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی کرے جو وہ بچے سے کرانا چاہتی ہے۔ والد کو بھی چاہیے کہ اپنی بیوی کے ساتھ شفقت کا رویہ رکھے تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ بیوی کو خوش رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جنت میں جانے پر بیویوں کو اختیار ہوگا کہ وہ اسی خاوند کے ساتھ رہیں یا کسی اور کو منتخب کر لیں۔ عموماً ہمارے ہاں تاثر یہ ہے کہ بیوی خاوند کو اس کے گھر والوں سے دور کر دیتی ہے۔ اس تاثر کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی اصلاح کے لیے کوشش ضرور کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح باپ کی ذمہ داری رزق حلال کما کر لانا ہے تاکہ اس کے اہل خانہ اپنی حیا کی حفاظت کر سکیں اور اس کی نسل بہترین صفات کے ساتھ پروان چڑھ سکے۔

یہ تربیت کا عمل چند دنوں کی بات نہیں ہے، عمر بھر کی ریاضت ہے۔ اس میں بے شمار مخالفین آئیں گے۔ کئی بار کرنے والے سے بھی غلطی ہو گی۔ کسی کرنے والے کے لیے یہ آسان ہو گا اور کسی کرنے والے کے لیے مشکل۔ مشکل اور آسانی بھی ہر ایک کے لیے مختلف ہو گی۔ سب سے بڑی مشکل تو اپنے نفس کی ہو گی، جو کبھی اس عمل کے عرق ریز ہونے سے گھبرا کر آسان رستے ڈھونڈے گا، کبھی نفس کی پسند کو دین کی کوئی شق سمجھ کر اپنے جذبات میں شامل کر لے گا، جس سے بلاوجہ کی دشمنیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کا بھی ایک حل ہے، جو چیز پیچیدہ ہو اور سمجھ میں نہ آنے والی ہو، وہ دین نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ دین تو آسان اور سہل ہے۔ اس پر چلنا ہر ایک کے لیے آسان ہے، چاہے پڑھا لکھا ہو، ان پڑھ ہو، ملازم پیشہ ہو، کاروباری ہو، گھریلو خاتون ہو یا گھر سے باہر جا کر کام کرنے والی ماں۔ اس لیے اگر کہیں لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے، بول چال بند ہو رہی ہے تو اس میں نفس شامل ہے۔

تربیت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کو برتنا اور سہنا سکھایا جائے۔ پوری طرح تو یہ کوئی انسان بھی دوسرے انسان کو نہیں سکھا سکتا، لیکن ایک اور حقیقت سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ زندگی میں صرف مثبت رویے ہی نہیں ہوتے۔ منفی رویے بھی زندگی کا حصہ ہیں، مثلاً غصہ، اداسی، سستی، برا گمان۔ ان رویوں کو برتنا بھی سکھانا ضروری ہے۔ غصہ نہ آنا، یا بدگمان نہ ہونا انسانی فطرت سے بعید ہے۔ اس کے لیے بھی ہمیں بچوں کو ماڈل دینا ہوگا۔ بچے کا واسطہ جب جھوٹ اور فریب سے پڑے گا تو وہ سوچے گا کہ میرے امی یا ابو اس سے کیسے نبٹتے تھے۔ برے رویوں کا ردعمل زیادہ ہوتا ہے، اسے ایک منضبط جواب میں بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تربیت سکھاتی ہے۔ ورنہ تو معاشرہ جنگل بن جائے۔ زندگی ایک مشکل امتحان ہے جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے۔ اس کی ایک مشکل کٹتی ہے تو دوسری شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ سب سے بڑی مشکل یعنی بڑھاپا شروع ہو جاتا ہے۔

تربیت کی اہمیت میں نے ایک حدیث سے سیکھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ بہترین ورثہ جو ایک والد اپنی اولاد کو دیتا ہے، وہ اچھی تعلیم و تربیت ہے۔ رہا مال و دولت تو وہ جتنا جس کے نصیب میں ہے، اسے مل جائے گا۔ میں نے اس حدیث سے اپنے لیے ترجیح مقرر کی۔ ایسا نہیں ہے کہ کمانے کے لیے محنت نہ کی جائے لیکن ان دونوں چیزوں میں سے ترجیح تربیت اور تعلیم کو دی جائے۔ جب کمانے کے لیے ماں یا باپ یا دونوں نکلتے ہیں تو کچھ کوششیں کامیاب ہوتی ہیں اور کچھ ناکام۔ اس دوران نفسیاتی دباؤ بھی بہت ہوتا ہے، بچے چھوٹے اور مسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کے کچھ لوگ آگے نکل جاتے ہیں جو اضطراب کا باعث بنتے ہیں اور آپ کے ساتھ کے کچھ لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں جو خوف کا باعث بنتے ہیں۔ اس وقت یہ حدیث آپ کو پہاڑ جتنا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ سمجھاتی ہے کہ کوشش کیے جاؤ، نصیب کہیں نہیں جائے گا، اور بچوں کی تعلیم و تربیت کیے جاؤ تم بہترین وراثت منتقل کر رہی ہو۔ یہ

D/Arshad hussain/batool/batool2017/ octo2017

اضطراب اور خوف آپ کے ذہن و دل کو متاثر کرتا ہے جس کے ظاہری اثرات آپ کے رویے کو متاثر کرتے ہیں اور یہ رویہ بچوں، سسرال، میکے سب پر ظاہر ہوتا ہے۔ جو رشتے نازک ہوتے ہیں، وہ زیادہ متاثر ہوتے ہیں، جو مضبوط ہوتے ہیں، وہ ایسے اتار چڑھاؤ برداشت کر جاتے ہیں۔ پھر اس میں رویے کے اظہار کا بھی رول ہوتا ہے۔ اگر اظہار کو کنٹرول کر لیا جائے تو نقصان کم ہوتا ہے۔

تطہیر فکر ایک ایسی چیز ہے جس کی اہمیت تو معلوم تھی لیکن اس کی اصل سمجھ پچاس سال کی عمر کے بعد آئی ہے۔ میں نے اسے بچوں کی تربیت میں بہت مفید پایا ہے۔ قرآن بار بار اس کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ ایمان بھی تو فکر کی اصلاح ہے، جب یہ ہوتی ہے تو پھر عمل صالح جنم لیتا ہے۔ مولانا مودودی نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ سوچ بنانے کی عمر بچپن ہی ہے۔ مجھے اس کا فائدہ اس لیے اب جا کر نظر آیا ہے کیونکہ میرے بچے اب بڑے ہوئے ہیں۔ اور مجھے اس کے اثرات ان پر نمایاں نظر آئے ہیں۔ کئی بار ہم ظاہری اعمال کو زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ کئی ٹین ایجر بچوں کی مائیں خصوصاً لڑکوں کی، اس بات پر پریشان ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھتے یا باپ ماں کو ناراض ہوتا ہے کہ بچوں کو نماز کے لیے نہیں کہا۔ حالانکہ بچپن میں ماں باپ نے پابندی سے نماز کی عادت ڈالی ہے اور اس کی اہمیت بھی سمجھائی ہے۔ اس پر گھر میں جھگڑا بھی ہوتا ہے۔ اس کے لیے صبر، حکمت اور دعا کی ضرورت ہے۔ اس عمر سے نکلتے ہی وہی بچہ بہترین نمازی بن جائے گا۔ ایسا عربوں کے بچوں میں بھی ہوتا ہے، اور وہ اسی حکمت سے کام لیتے ہیں۔ ایک بار جب میں نے اپنے بیٹے کو نماز کے لیے توجہ دلائی تو اس نے مجھے کہا کہ آپ نے ہمیں شروع سے نماز کی ترغیب دی ہے، مسجد ساتھ لے کر گئے ہیں، اب ہم بڑے ہیں، یہ ہمارا فرض ہے کہ نماز ادا کریں، آپ نے اپنا فرض پورے طرح نبھا دیا ہے۔

اسی طرح کہانی سنانا تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب تک بچے کہانی سننے کی عمر میں ہوں، انہیں ضرور سنائیں۔ بچے کے دل کی بات سنیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے جو پیار کرتے تھے، اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کریں۔ بچے مستقبل کا سرمایہ ہیں، ان کی نگہبانی کریں۔ ہم بچوں کو فرائض شروع سے ہی سکھانا چاہتے ہیں۔ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق سب ان تک پہنچا دیتے ہیں۔ بزرگوں کا ادب احترام سکھا دیتے ہیں، لیکن سب کے سامنے بچے پر تبصرے کرتے ہیں، بزرگ بچے کے ساتھ درشت سلوک کرتے ہیں، بچے کی غلطی پر نامناسب طریقے سے اسے ٹوکا جاتا ہے۔ ننھے دل بہت زور سے ٹوٹتے ہیں اور بڑی مشکل سے جڑتے ہیں۔ کم از کم اپنوں کو تو یہ دل نہیں توڑنے چاہئیں۔ ایک بار جب ہم جبیل میں تھے تو جماعت کی طرف سے دی گئی عید ملن پارٹی میں ایک صاحب نے درس دیا۔ میرے بیٹے آ کر مجھے کہنے لگے کہ بہت اچھے انکل تھے جنہوں نے آج درس دیا ہے۔ شکر ہے کہ کسی نے بچوں کی بات بھی کی ہے۔ دو تین بار میری بیٹی نے سکول جانے سے اور صبح اٹھنے سے ناگواری کا اظہار کیا۔ وہ کچھ غصے اور تناؤ میں تھی۔ میں نے جب کریدا تو اندازہ ہوا کہ اس کا کچھ کام تھا جو اس سے مکمل نہیں ہو سکا۔ میں نے اس کام کو مکمل کرنے میں اس کی مدد کی، تو اس کا سارا تناؤ دور ہو گیا۔

کچھ دن پہلے میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پچھلے سکول میں تم نے بہت دیر سے اور بہت کم دوست بنائیں، نئے سکول میں آتے ہی ساری کلاس تمہاری دوست ہے۔ یہ بہت اہم سوال تھا جو میں نے اس سے کئی بار کیا اور اس نے مجھے کبھی اس کا جواب نہیں دیا۔ پہلے وہ امریکن سکول میں تھی، اب ایک انٹرنیشنل سکول میں ہے جو امریکی نہیں ہے۔ میں جب بھی اس کی سکول میٹنگز میں جاتی تھی تو اس کے بارے میں ایک ہی بات کہی جاتی تھی کہ یہ کلاس میں الگ تھلگ رہتی ہے، گھلتی ملتی نہیں ہے۔ ویسے یہ پڑھائی میں بھی آگے تھی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی۔ سکول کی ایک تصویر میں یہ بالکل اکیلی بیٹھی ریت سے کھیل رہی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر میں ہمیشہ اس سے سوال کرتی تھی کہ تم اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔ پچھلے ہفتے اس نے مجھے اس کا جواب دیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ امی اس سکول میں میرے اپنے جیسے بچے بہت کم تھے۔ تھوڑا بڑا ہوتے ہی بچے گالیاں دینا شروع کر دیتے تھے، اس سے مراد برے

الفاظ ہیں جن سے ہم بچوں کو منع کرتے ہیں، یعنی abusive words بچوں کا رویہ امریکیوں جیسا ہوتا تھا۔ آپ نے ہمیں گھر میں کچھ اور سکھایا تھا۔ اس لیے میری ان سے دوستی نہیں ہوسکتی تھی، تو میں الگ تھلگ رہتی تھی۔ اب سب بچیاں ایک جیسی ہیں، اس لیے میری سب سے دوستی ہے۔ میں اس دن سے سوچ رہی ہوں کہ ہمارے بچے ہم سے اچھے ہیں۔

ایسے ہی ایک دو مثالیں ذہن میں آرہی ہیں۔ میری ایک عزیزہ اپنے سسرال کی کچھ باتوں کو محسوس کرتی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ وہ ان کے دیور اور دیورانی کا زیادہ خیال رکھتے ہیں بہ نسبت ان کے اور ان کے میاں کے۔ ان عزیزہ نے اس احساس کے باوجود اپنا رویہ مناسب رکھا۔ کچھ دن پہلے ان کے دیور کے بچے کا نتیجہ آیا اور وہ فیل ہوگیا۔ اب سب سسرال والے میری عزیزہ کی تعریف کررہے ہیں کہ اس نے اپنے بچوں اور گھر کو وقت دیا ہے، اس لیے اس کے بچے بھی لائق ہیں، گھر بھی سلیقے سے چلا رہی ہے اور سسرال کا بھی بہترین خیال رکھتی ہے۔ تو صحیح اور غلط کی تفریق تو سب سمجھ جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور خاندان کی بات پتہ چلی۔ والد یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور والدہ گھریلو خاتون۔ تعلق گاؤں سے تھا۔ اس لیے شہر میں مہمان نوازی بہت تھی۔ والدہ سارا دن باورچی خانے میں مصروف رہتی تھیں۔ والد یونیورسٹی اور مہمانوں میں۔ بچوں نے تھوڑا بہت کچھ پڑھا اور بس۔ عموماً پڑھے لکھے والدین کے بچے پڑھے لکھے ہوتے ہیں، لیکن اس طرح کی افسردہ مثالیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔

بچوں کی تربیت وسیع ذہن اور کھلے دل سے کریں۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے ہدایت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اس خوش نصیبی میں دوسروں کو بھی شریک کریں۔ ایک دن میں کسی سے کسی بات پر خفا ہورہی تھی، میرا بیٹا مجھے کہنے لگا، ''امی ایسے نہ کریں، آپ کو اللہ نے زیادہ خوش نصیب بنایا ہے، جانیں دیں''۔ صلہ رحمی اتنی بڑی چیز ہے کہ غیر مسلم رشتہ دار سے بھی اسے جوڑنے کا حکم ہے اور ان نیکیوں میں سے ہے جن کا اجر دنیا ہی میں مل جاتا ہے۔ اس کو کاٹ کر تربیت نہیں ہوسکتی۔

ہماری سب کوششوں کے باوجود اور تمام تر تربیت کے باوجود ہم بچے کو سب نہیں سکھا سکتے۔ یہ زندگی سکھاتی ہے۔ اسی طرح اس کے نصیب کا فیصلہ اللہ کی ذات کرتی ہے۔ ہمارا کام تو دل کھول کر ان ننھے پودوں کی آبیاری کرنا ہے، انہیں حالات کی کڑی دھوپ سے بچا کر بڑا کرنا ہے تاکہ وہ اپنے حصے کا کام کرسکیں اور ہم ان کی خوشیاں دیکھ سکیں۔ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے، ہماری نیکی ہمارے والدین کے کام بھی آتی ہے اور ہماری اولاد کے بھی کام آتی ہے۔ ہماری کی ہوئی نیکیاں اور دعائیں ان کی حفاظت کرتی ہیں، بلاؤں سے، گناہ سے اور شیطان کے شر سے۔

☆.....☆.....☆

فریدہ خالد

کھجور کھاؤ یا خون کی بوتل لگواؤ

یہ تقریباً آج سے 20 سال پرانی بات ہے۔ میں دورانِ حمل اپنے روٹین چیک اپ کے لیے کلینک میں تھی۔ اس دن وہاں موجود نرس میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ میری تمام بلڈ رپورٹس اس کے پاس ہیں اور میں جاتے ہوئے انہیں لیتی جاؤں۔ اس کے بعد اس نے تاکید کی کہ مجھے اپنی ڈائٹ پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ مجھے خون کی معمولی کمی ہے اور اگر میں نے اپنی خوراک میں فروٹ، مچھلی، دودھ، دہی، انڈے اور سبز پتوں والی سبزیوں کو شامل نہ کیا تو یہ کمی بڑھ جائے گی۔ میری خاموشی کو سمجھتے ہوئے اس نے مجھے آسان نسخے کے طور پر پالک اور کلیجی وغیرہ کھانے کا مشورہ دیا لیکن مجھے یہ دونوں ہی سخت ناپسند تھیں۔ خاص طور پر پالک صاف کرنا اور پکانا تو بہت وقت طلب کام لگتا تھا اور کلیجی کی بو مجھے ناپسند تھی۔ اس نے کلیجی بنانے کی آسان سی ترکیب بتائی کہ بس تین یا چار بوٹیاں لو اور اسے تکہ مصالحہ لگا کر 10 منٹ رکھ دو پھر آدھا چمچ تیل فرائی پین پر ڈال کر اس پر بوٹیاں ڈال کر ڈھک دو۔ اور ہلکی آنچ پر پانچ یا چھ منٹ پکنے دو۔ مزیدار کلیجی تیار ہے۔

میں نے بے دلی سے اس سے وعدہ کیا اور گھر آ گئی۔ کلیجی لانے کے لیے بازار بھیجا تو معلوم ہوا کہ کلیجی کے لیے تو گوشت والے کو شام کو بتانا ہوتا ہے تب صبح کلیجی ملے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ہر گوشت والے کا طریقہ تھا یا ہمارے علاقے میں ہی ایسا تھا۔ شام کو بھیجا کہ ایک پاؤ کلیجی کا آڈر بک کر کے آئیں۔ صبح اسے منگوایا اور بنا کے ساتھ ہی آفس لے گئی۔ لنچ ٹائم میں کوشش کر کے کھایا میری ساتھی کو تو وہ بہت پسند آئی اور اس کے ساتھ میں نے بھی کلیجی کھا لی۔ اگلے دن میں نے زیادہ منگوالی تاکہ رات کو بنالوں صبح اس کی بو سے طبیعت خراب ہونے لگتی تھی۔ میں سات یا آٹھ دن سے زیادہ اس عمل کو جاری نہ رکھ سکی۔ بس سستی یا غفلت کے باعث۔ جب اگلے چیک اپ پر گئی تو اسی نرس نے مجھ سے کلیجی کھانے کا پوچھا۔ کیا کمال کا حافظہ پایا تھا محترمہ نے! میں نے اسے سب سچ سچ بتا دیا۔ وہ تھوڑی سی ناراض نظر آئی پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''تم میٹھی چیزیں پسند کرتی ہو؟'' میں نے خوشی سے کہا ''میٹھا تو مجھے بہت پسند ہے''۔

اس نے مسکرا کر کہا ''اچھا تو پھر کھجور کھانا شروع کر دو۔ روزانہ تین سے پانچ عدد باقاعدگی سے کھانی ہیں''۔ میں نے کہا ''کھجور تو میں بس رمضان میں افطار کے وقت ایک عدد کھاتی ہوں۔ زیادہ کھانے سے وزن بڑھ جاتا ہے''۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا اور آخری حربے کے طور پر اس نے وہ جملہ کہا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ اس نے کہا۔

''کھجور کھاؤ یا خون کی بوتل لگوانے کے لیے تیار رہو''۔

اس جملے نے مجھ پر جادو کا سا اثر کیا۔ میں گھبرا کر بولی۔

''خون کی بوتل.....نہیں مجھے خون نہیں لگوانا''۔

اس نے کہا ''بس آج سے کھجور کھانا شروع کر دو۔ بعد میں آئرن سپلیمنٹ شروع کر دیں گے کیونکہ اس حالت میں اکثر خواتین کو آئرن سپلیمنٹس کی ضرورت ہوتی ہے''۔ میں خاموش رہی۔

راستے ہی سے میں نے دو پیکٹ کھجور کے لیے اور گھر پہنچ کر سب سے پہلا کام کھجور کھانے کا کیا اور اب تک میری یہی روٹین ہے کہ روزانہ ایک یا دو کھجوریں کھاتی ہوں کبھی کبھار ہی ناغہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سلاد، فروٹ، گوشت اور دہی کو بھی اپنی خوراک میں شامل کیا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کھجور اور یہ سب کھانے سے میرا ایچ بی بہتر ہو گیا اور سب کچھ خیریت سے ہوا۔

آج بھی کھجور کھاتے ہوئے مجھے یہ بات یاد آتی ہے اور میں اکثر خواتین کو کھجور کھانے کا مشورہ دیتی ہوں کیونکہ اس میں آئرن کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں پچاس فیصد سے زیادہ حاملہ خواتین آئرن کی کمی کا شکار ہوتی ہیں جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انہیں خون کی کمی ہے۔ یوں تو خون کی کمی کی کئی اور وجوہات بھی ہیں لیکن حاملہ خواتین میں اکثر اس کی بڑی وجہ آئرن کی کمی ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر خواتین اپنی خوراک کے معاملے میں لاپروا ہوتی ہیں یا انہیں مناسب خوراک میسر نہیں ہوتی۔ اور آج کل تو ڈائٹنگ کے چکر میں اکثر لڑکیاں اپنی خوراک اور صحت دونوں ہی داؤ پر لگا دیتی ہیں۔ لہٰذا خون کی کمی کا شکار ہونے سے بچنے کے لیے ہم سب کو اپنی خوراک کا خیال رکھنا چاہیے اور متوازن خوراک کو ہی اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہیے خاص طور پر دورانِ حمل خواتین کو خصوصی طور پر بہتر خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ متوازن خوراک سے مراد مہنگی چیزیں کھانا نہیں ہے بلکہ موسم کے مطابق ملنے والی اشیا جو کہ عموماً سستی ہوتی ہیں انہیں اپنی خوراک کا حصہ بنانا چاہیے۔ متوازن خوراک کھانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے وزن نہیں بڑھتا اور مختلف اقسام کے وٹامنز اور پروٹین وغیرہ کی کمی سے ہونے والے مسائل سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پھلوں اور سلاد وغیرہ سے فولک ایسڈ اور وٹامنز ملنے سے آئرن خون میں باآسانی جذب ہو کر خون بنانے میں مددگار ہوتا ہے۔

اب کچھ ذکر کھجور کا جس نے دورانِ حمل میری صحت کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور خون کی بوتل لگوانے سے بچایا، الحمدللہ۔ یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ خون لگوانا کوئی غلط کام نہیں ہے بلکہ زندگی کو بچانے کے لیے اگر اس کی ضرورت ہو تو ضرور اپنے معالج کی ہدایات پر عمل کریں مثلاً اگر ایکسیڈنٹ میں کسی کا بہت خون بہہ گیا ہے اور خون لگوانے کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں کھجور کھانا یا متوازن غذا کھانے کا اصرار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اس سے فائدہ ہوگا۔

کھجور ایک سستا اور آسانی سے دستیاب ہونے والا پھل ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ ہمارے ملک میں اس کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم پھر بھی اس پھل سے فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ بہت افسوس کی بات ہے۔ پاکستان میں خیر پور، ڈیرہ غازی خان اور ملتان میں تو اعلیٰ درجے کی کھجوریں میسر ہیں اور اس کی کئی اقسام موجود ہیں۔ کھجور کے درخت کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا سر (یعنی شاخیں) آگ میں یعنی دھوپ یا گرمی میں اور پیر (جڑیں) پانی میں ہوتے ہیں۔ اس کی جڑیں کافی لمبی ہوتی ہیں تاکہ زیرِ زمین پانی جو کہ گہرائی میں ہوتا ہے اس تک پہنچ سکیں۔ یہ پھل شدید گرمی میں لگتا ہے اور اس کے ایک گچھے میں کئی سو تک دانے ہوتے ہیں۔ اس کی اوسط عمر 150 سال ہوتی ہے۔ یہ ایک بے حد مفید درخت ہوتا ہے کیونکہ اس کا کوئی حصہ بھی بیکار نہیں ہوتا۔ ہمارا دین جو دینِ فطرت ہے، اس نے بھی اس پھل کو بہت اہمیت دی ہے۔ آیئے دیکھیں۔

کھجور قرآن وسنت کی روشنی میں

کھجور کو تمام مذاہب میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر اس کا ذکر ملتا ہے، خاص طور پر اس کی دو اقسام نخل اور رطب کا۔ کھجور جنّت کے پھلوں میں سے ایک پھل ہے۔ سورہ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور جنّتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان دونوں میں میوے اور کھجور اور انار ہوں گے'' (68)۔

سورہ المومنون میں فرمایا:

''اسی پانی سے ہم تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کرتے ہیں کہ تمہارے لیے ان میں بہت سے میوے ہوتے ہیں انہی میں سے تم کھاتے ہو'' (19)۔

مزید فرمایا: ''اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگور کے باغات پیدا کیے'' (34: یٰسین)۔

سورہ ق میں ارشاد ہوتا ہے:

''اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت جن کے خوشے تہ بہ تہ ہیں'' (ق:10)۔

سورہ مریم میں بھی اس کا ذکر خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش

کے سلسلے میں آتا ہے۔

احادیث میں بھی ہمیں کھجور کا ذکر کثرت سے ملتا ہے اور کھجور نبی پاکؐ کو بے حد پسند تھی۔ آپؐ نے اس کے درخت کو مسلمان درخت کہا ہے۔ کیونکہ یہ ایک صابر، شاکر اور اللہ کی طرف سے ایک بابرکت درخت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ سے مروی ہے کہ ہم کچھ لوگ نبیؐ کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ کھجور کا گابھ لایا گیا۔ آپؐ نے ہم سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ درختوں میں سے ایک درخت ایسا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ایسے برکت دی ہے جیسے کہ وہ مسلمان ہو۔ میں نے گمان کیا کہ آپؐ کی مراد کھجور کے درخت سے ہے۔ اور میرا ارادہ ہؤا کہ میں جواب میں عرض کروں کہ یارسول اللہؐ یہ کھجور کا درخت ہے۔ مگر مجبوراً اس لیے چپ ہؤا کہ اتنے لوگوں میں سے میں سب سے چھوٹا تھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ یہ کھجور کا درخت ہے (بخاری)۔ کھجور کو مسلمان سے تشبیہ دینے کے بارے میں امام ابنِ قیم الجوزیہؒ اپنی کتاب طبِ نبویؐ میں فرماتے ہیں:

''کہ مسلمان میں کثرتِ خیر کھجور کے انداز کا ہوتا ہے۔ اس کا سایہ ہمیشہ رہتا ہے، اس کا پھل خوشگوار ہوتا ہے اور اس کا وجود دائمی ہوتا ہے'' (صفحہ 475)۔ وہ اسے بطور غذا اور دوا استعمال کرنے کا مشورہ دینے کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ ''کھجور کے تنے سے مکانات، آلات اور ظروف تیار کیے جاتے ہیں، اس کی پتیوں سے چٹائیاں، پیمانے، برتن اور پنکھے وغیرہ بنائے جاتے ہیں، اور اس کی چھال سے رسیاں اور گدیدار بستر وغیرہ بنائے جاتے ہیں، اور اس کی گٹھلی اونٹوں کے لیے چارہ کا کام دیتی ہے'' (صفحہ 475)۔ اس کی صنعت سے متعلق مزید خوبیاں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''اس درخت سے مردِ مسلم کے علاوہ کون سی چیز زیادہ مشابہ ہوسکتی ہے جب کہ مسلمان سراپا خیر ہوتا ہے، اور ظاہر و باطن دونوں طور پر اس سے نفع مقصود ہوتا ہے'' (صفحہ 476)۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھجور ایک اہم اور بابرکت پھل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھما سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''جس گھر میں کھجور ہو اس گھر والے کبھی بھوکے نہ رہیں گے'' (المسلم)۔

اسی طرح حضرت سلمٰی رضی اللہ عنھا روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا'' جس گھر میں کھجوریں نہ ہوں وہ گھر ایسا ہے کہ جیسے اس میں کھانا نہ ہو''۔ کھجور جنّت کا پھل ہے۔ حضرت رافع بن عمر المزنی رضی اللہ بیان فرماتے ہیں۔ ''میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ عجوہ کھجور اور بیت المقدس کی مسجد کا گنبد دونوں جنّت سے آئے ہیں'' (ابنِ ماجہ)۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ کی شادی اور ولیمہ کی دعوت کا حال بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''میں لوگوں کو ولیمہ کی دعوت پر بلا لایا۔ چمڑے کا دسترخوان بچھایا گیا اور اس پر کھجور، پنیر اور گھی رکھا گیا (بخاری)۔ کچھ اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کا حلوہ بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ بہرحال آپؐ کے دعوتِ ولیمہ میں کھجور شامل تھی۔ اس کے علاوہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نوزائدہ بچے کے لیے کھجور ایک بہترین گھٹی ہے۔ حضرت اسماء بنتِ ابوبکر رضی اللہ اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر کو پیدائش کے بعد نبیؐ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئیں۔ اور آپؐ کی گود میں ڈال دیا۔ آپؐ نے کھجور منگوائی۔ اسے اپنے منہ میں چبایا پھر اپنا لعاب اور کھجور بچے کے منہ میں ڈال کر اس کے تالو سے لگا دیا پھر بچے کے لیے برکت کی دعا کی۔ یہ مسلمانوں میں ہجرت کے بعد پیدا ہونے والا پہلا بچہ تھا۔ (بخاری، مسلم)۔ اس کے علاوہ حضرت ابوموسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ ''میرے گھر لڑکا پیدا ہؤا۔ میں اسے لے کر نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہؤا۔ آپؐ نے چبا کر اس کے منہ میں کھجور ڈالی'' (بخاری)۔

ان احادیث مبارکہ کو پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ آج ہمارے گھروں میں سے ایسے کتنے گھر ہیں جن میں کھجوریں رمضان کے علاوہ آتی ہوں گی اور کھائی جاتی ہوں گی۔ میں نے ان کا استعمال ان کی طبی فوائد کے پیشِ نظر کیا۔ اب جب کہ ان کی اتنی اہمیت کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے تو ہمیں کوشش کرنی ہے کہ اپنے گھروں میں اس پھل کو لائیں بھی اور کھائیں بھی اور بچوں کو بھی اس کی عادت ڈالیں۔

کھجور کی طبی افادیت

کھجور کی طبی افادیت بھی بہت زیادہ ہے۔ احادیث میں کھجور کو کئی

ایک امراض اور تکالیف سے بچاؤ اور علاج کے طور پر استعمال کا ذکر ملتا ہے خاص طور پر عجوہ کھجور کا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھما روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ: ''اس عظیم کھجور عجوہ میں ہر بیماری سے شفا ہے اور اگر اسے نہار منہ کھایا جائے تو یہ زہروں سے تریاق ہے'' (المسلم)۔ عجوہ کھجور زہر کے ساتھ ساتھ جادو کا اثر زائل کرنے میں بھی بہترین ہے۔ مسند احمد میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ملتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''جس نے صبح اٹھتے ہی عجوہ کھجور کے سات دانے کھا لیے، اس دن اسے جادو اور زہر بھی نقصان نہ دے سکیں گے'' (متفق علیہ)۔ آج کل اکثر لوگ اس بات سے بھی پریشان رہتے ہیں کہ ان پر کسی نے جادو کروا دیا ہے لہٰذا جسے بھی اس قسم کا خیال گزرے تو وہ اس حدیث پر عمل کرے انشا اللہ ضرور افاقہ ہوگا۔ عجوہ ہی کے بارے میں ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنھما سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''اگر سات دن تک عجوہ کھجور کے سات دانے روزانہ کھائے جائیں تو اس سے کوڑھ میں فائدہ ہوتا ہے'' (ابونعیم)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ روایت کرتے ہیں کہ ''کھجور کھانے سے قولنج نہیں ہوتا (ابونعیم)۔ آج کل اکثر مائیں بچوں کے پیٹ میں کیڑوں کی شکایت سے پریشان رہتی ہیں انہیں چاہیے کہ وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ سے مروی اس حدیث پر عمل کریں،'' آپؐ نے فرمایا کہ ''صبح نہار منہ کھجوریں کھایا کرو کہ ایسا کرنے سے پیٹ کے کیڑے مر جاتے ہیں'' (مسند فردوس)۔

عجوہ کھجور کو گٹھلیوں سمیت کھانے سے دل کے امراض سے نہ صرف بچا جا سکتا ہے بلکہ اس سے علاج بھی ممکن ہے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ سے روایت ہے ''میں بیمار ہوا۔ میری عیادت کو آپؐ تشریف لائے آپؐ نے اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا تو اس کی ٹھنڈک میری ساری چھاتی میں پھیل گئی۔ پھر فرمایا کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے اسے حارث بن کلدہ کے پاس لے جاؤ جو ثقیف میں مطب کرتا ہے حکیم کو چاہیے کہ وہ مدینہ کی سات عجوہ کھجوریں گٹھلیوں سمیت کوٹ کر اسے کھلائے'' (مسند احمد)۔ ڈاکٹر خالد غزنوی اپنی مشہور کتاب ''طبِ نبوی اور جدید سائنس'' (حصہ اول، 1998) میں اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''کھجور کے فوائد کے بارے میں یہ حدیث بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ طب کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ کسی مریض کے دل کے دورہ کی تشخیص کی گئی'' (ص276)۔

اس کے علاوہ جن لوگوں کو کمزوری ہو یا دبلے پن کا شکار ہوں وہ اپنا وزن بڑھانے کے لیے اس کا استعمال کر سکتے ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی والدہ نے انہیں کئی دوائیں دیں تا کہ وہ موٹی ہو جائیں لیکن کسی دوا سے فائدہ نہ ہوا پھر انہیں تازہ پکی ہوئی کھجوریں اور کھیرے کھلائے جس سے وہ موٹی ہو گئیں۔ اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگ جو وزن گھٹانا چاہتے ہیں یا وزن میں کمی کرنا چاہتے ہیں وہ اسے نہیں کھا سکتے بلکہ اسے اعتدال کے ساتھ کھانا انہیں بھی فائدہ دے گا۔ مثلاً نبیؐ کھجور کو مکھن کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے اور ہم سب جانتے ہیں کہ آپؐ کا وزن کبھی بھی نہیں بڑھا۔ اسی طرح اگر رات کا کھانا نہ کھانے کو دل چاہے تو بھوکا رہنے کے بجائے چند دانے کھجور کے کھا لینے چاہئیں۔ ایک روایت میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبیؐ نے فرمایا ''رات کا کھانا ہرگز نہ چھوڑو چاہے ایک مٹھی کھجور ہی کھا لو۔ کیونکہ رات کا کھانا ترک کرنے سے بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے'' (ابن ماجہ)۔ اور آجکل تو جھریوں سے بچنے کے لیے کھجور کا ماسک بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس میں اسے گرائنڈ کر کے پیسٹ بنا کر چہرے پر لگایا جاتا ہے لہٰذا اگر کسی کو یہ مسئلہ درپیش ہو تو آزما کر دیکھ لیں۔ کھجور کی گٹھلی سے بھی کئی فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں مثلاً کھجور کی گٹھلی جلا کر اگر دانتوں پر منجن کی طرح ملی جائے تو اس سے منہ کی بدبو کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اس منجن کے مسلسل استعمال سے دانت بھی چمکدار ہو جاتے ہیں۔ کھجور کی گٹھلیوں کو بھون کر ان کو کافی کی شکل میں پیا جاتا ہے جسے ''کھجور کافی'' کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں بھی کھجور سے علاج کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت مریمؑ کے بارے میں ہے کہ جب ان پر زچگی کا وقت قریب آیا تو وہ درد کی شدت، اپنی تنہائی اور بعد کی کمزوری سے اس قدر دہشت زدہ تھیں کہ انہوں نے اللہ سے چاہا کہ وہ اس اذیت سے تڑپنے کے بجائے مر

جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا، ''اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ تم پر تازہ کھجوریں گر پڑیں گی'' (مریم:25)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زچگی کی تکلیف کو کم کرنے اور بھرپور توانائی حاصل کرنے کے لیے اس پھل کو کھانے کا حکم فرمایا۔ اس پھل کو کھانے سے نہ صرف ان کی کمزوری جاتی رہی بلکہ درد بھی کم ہوگیا، اور انہیں توانائی ملی۔ ڈاکٹر خالد غزنوی اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''کھجوریں کھانے سے ان (مریمؑ) کی زچگی جلد مکمل ہوئی۔ نفاس سے کوئی خاص اذیت نہ ہوئی اور وہ اپنے نوزائیدہ بچے کو گود میں لے کر اطمینان کے ساتھ بستی کی سمت پیدل چل پڑیں۔ عام حالات میں کسی عورت کے لیے زچگی کے بعد اپنے پیروں سے چل کر جانا ممکن نہیں ہوتا۔ اور یہ خاتون تو نہ صرف فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں بلکہ بچے کا وزن اٹھا کر انہوں نے بستی تک کا فاصلہ بھی خوش اسلوبی سے طے کیا'' (ص، 277)۔ یعنی انہیں فوری توانائی میسر ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ کھجور زچہ اور بچہ دونوں ہی کے لیے ربانی غذا ہے۔ جیسا کہ پہلے میں نے عرض کی کہ آپؐ بچوں کو کھجور کی گھٹی دیتے تھے۔

کھجور کی اس فوری توانائی مہیا کرنے کی خاصیت کے پیشِ نظر ہی آپؐ روزہ کھولنے کے لیے اسے پسند فرماتے تھے کیونکہ روزے کے دوران جسم میں نقاہت ہوتی ہے۔ اور ایسے وقت میں ایسی ہی غذا کی ضرورت ہوتی ہے جو فوری توانائی سے بھرپور ہو اور زود ہضم بھی ہو تا کہ کمزوری کو فوراً دور کر دے۔ کھجور میں وٹامنز اور منرلز کے علاوہ تمام مطلوب عناصر مناسب مقدار میں پائے جاتے ہیں اسی لیے عہدِ رسالت میں اکثر جنگی کارروائیوں میں مجاہدین کو کھجور اور ستو کھانے کو دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ آپؐ کھجوروں کا پانی یا آج کل کی اصطلاح میں شیک پینا بھی پسند فرماتے تھے جسے نبیذ کہا جاتا ہے اور یہ ایک خوش ذائقہ اور توانائی سے بھرپور مشروب ہے۔ اس کے علاوہ اس پھل سے مختلف اقسام کے حلوہ جات، مٹھائیاں اور کیک وغیرہ تیار کیے جاسکتے ہیں لہٰذا کھجور کو مختلف انداز سے بدل بدل کر کھایا جائے تو سب گھر والے اسے پسند کریں گے۔

کھجور کے استعمال میں کچھ احتیاط بھی لازم ہے۔ آپؐ نے جہاں کھجور کے استعمال پر اپنے صحابہ کو ابھارا ہے وہیں کچھ جگہوں پر اسے کھانے سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی ایسے حالات میں احتیاط برتنی چاہئے۔ مثلاً آنکھوں کی سوزش میں اور بیماری سے اٹھنے کے فوراً بعد زیادہ مقدار میں کھجور نہیں کھانی چاہئے۔ اسی طرح آپؐ نے کھجور اور منقہ کو بیک وقت کھانے سے منع فرمایا ہے۔

امید ہے کہ کھجور کو ہم سب اپنے خوراک کا حصہ بنائیں گے اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ سنت پر عمل بھی کریں گے۔

حوالہ جات:

Mawani, M., Ali, S. A., Bano, G., Ali, S. A. (2016). Iron Deficiency Anemia among Women of Reproductive Age, an Important Public Health Problem: Situation Analysis. Current Research., 5(3), 1-6.

ڈاکٹر خالد غزنوی (1998) طب نبوی اور جدید سائنس (حصہ اول)۔ زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور طب نبویؐ اما م ابن قیم الجوزیہؒ۔ (691ھ۔751) ترجمہ حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی۔ مکتبہ محمدیہ۔

☆.....☆.....☆

محشرِ خیال

پروفیسر خواجہ مسعود۔ راولپنڈی

اپریل کا شمارہ نہیں مل سکا تو سب نے اسے بہت مس کیا لیکن اب اپریل و مئی کا شمارہ اکٹھا ملا تو اس ضخیم اور خوبصورت ''چمن بتول'' کو دیکھ کے ساری اداسی دور ہوگئی۔ ''چمن بتول'' کا ادارتی بورڈ اور تمام عملہ مبارکباد اور تحسین کا مستحق ہے کہ ابتلا کے اس دور میں انتھک شبانہ روز محنت کر کے ''چمن بتول'' کو قارئین تک پہنچایا۔

ہلکے گلابی، نارنجی اور سفید رنگوں سے مزین ٹائٹل دلوں کو بھا رہا ہے اداریہ میں پاکستانی عوام کے لیے درد دل اور تڑپ کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد ہم سب کو ''کرونا'' کی موذی وبا سے نجات عطا فرمائے (آمین)۔ آپ نے اداریہ میں سلیم احمد کے پیارے اشعار درج کیے ہیں۔

جانے کیا ہے کہ اُس ندی کے پار
اک دیا جل رہا ہے برسوں سے
کس کو آواز دے رہے ہو سلیم
شہر یہ سو رہا ہے برسوں سے

''ابتلاء و آزمائش'' ڈاکٹر میمونہ حمزہ صاحبہ نے اپنے اس اثر انگیز مضمون میں بجا فرمایا ہے کہ تربیت کے لیے انسان کو مصائب کی بھٹی میں گزارا جاتا ہے۔ لیکن اس میں خوشخبری صبر کرنے والوں کے لیے ہے۔ مسلمانوں پر جان و مال کی آزمائش آتی رہتی ہیں ایسے میں ثابت قدمی اور صبر سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی ساری زندگی آزمائشوں میں گزری اور آپ ہر آزمائش میں سرخرو ہوئے۔ خود ہمارے رسول پاکؐ کی زندگی میں بے شمار مشکل آزمائشیں آئیں۔ شعبِ ابی طالب میں خاندان کے ساتھ مشکل ترین دن گزارنا، طائف میں پتھر کھا کر لہولہان ہونا، کفار کے طعن و تشنیع، ظلم و ستم کچھ بھی تو آپ کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کر سکا۔ آزمائش میں کثرت سے توبہ استغفار کرنی چاہیے اور اللہ کی طرف ہی رجوع کرنا چاہیے۔

میمونہ صاحبہ کا ہی دوسرا مضمون ''رسول اللہؐ کی زندگی میں خواتین (دوسرا حصہ) شامل اشاعت ہے۔ حضورؐ کی ازواج مطہرات کو تمام مسلمان گھرانوں کے لیے اور خاص طور پر خواتین کے لیے ایک مثالی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اس مضمون میں واضح کیا ہے کہ ہمارے پیارے نبیؐ کا گھرانہ وہ مرکز ہے جہاں سے ساری دنیا کو اللہ کے احکام اور نبیؐ کا طریقہ ملتا ہے۔ امہات المومنین کا درجہ بہت زیادہ ہے اور وہ ہم سب کے لیے انتہائی قابل احترام ہیں۔

''اپنی اولاد کو آگ سے بچائیے'' (سلمیٰ وہاب) اولاد کی احسن تربیت کے لیے ایک بہترین مضمون ہے۔ آپ نے واضح کیا ہے کہ بچوں کے اندر زندگی کا مقصد راسخ کرنا چاہیے۔ ان کے دلوں میں اللہ اور رسولؐ کی محبت پیدا کی جائے ان کے اندر اعتماد پیدا کرنا چاہیے۔ بچوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہیے ان کی اچھی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا والدین کا فرض اولین ہے۔

''چراغ مصطفوی'' (بریرہ صدیقی) بہت پیارا مضمون ہے۔ بتایا گیا ہے کہ رسول پاکؐ کی محبت ہر مسلمان کا سرمایہ ہے۔ آپ نے ایک فرانسیسی یہودی کے الفاظ نقل کیے ہیں ''مسلمانوں کو ختم کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آخری مسلمان کے دل میں ان کے نبیؐ سے محبت کا ایک ذرہ بھی موجود ہے''۔ آپ نے ایک انگریز مدبر کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں ''اصحاب رسولؐ گویا ہیروں کی نرسری ہیں جن میں سے ہر ایک کی الگ آب و تاب اور چمک ہے''۔ واقعی اصحاب رسولؐ روشن

ستاروں کی مانند ہیں۔

''رسول اللہؐ کے حکیمانہ اقدامات'' (محمد صفدر بشیر) آپ نے واضح کیا ہے کہ ہمارے رسول پاکؐ کے ارشادات واقدامات کی اہمیت آج کے دور میں بے حد محسوس کی جا رہی ہے۔ آپ نے مدینہ میں شاندار معاہدہ (میثاق مدینہ) کیا۔ مسجد نبویؐ کو ایک یونیورسٹی اور اسلامی سیکرٹریٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف مسلمان بلکہ دنیا کے غیر مسلم بھی رسول پاکؐ کے بتائے ہوئے سنہری اصولوں اور اقوال کی روشنی میں اقدامات اٹھا رہے ہیں۔

''رمضان المبارک میں کرنے کے کام'' (ڈاکٹر ام کلثوم) رمضان المبارک کی ساعتوں میں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے اس مضمون میں بے حد قیمتی مشورے دیے گئے۔ اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ عبادت اور توبہ استغفار کرنا چاہیے۔ قرآن کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جائے کیونکہ قرآن پاک ایک نور ہے۔ سیرت رسولؐ اور صحابہ کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ رمضان میں غریبوں، مسکینوں کو کھانا کھلانا بے حد باعث ثواب ہے۔ روزہ کان، ہاتھ اور سارے جسم کا ہے نہ کہ صرف کھانے پینے سے پرہیز۔ رمضان المبارک کے بارے میں نہایت مفصل اور خوبصورت مضمون ہے۔

''قدرت کی تنبیہہ'' یہ میرا لکھا ہوا مضمون ہے۔ اس کے بارے میں اداریہ میں مدیرہ محترمہ صائمہ اسما نے جو ایک جملے میں اس کی خوبصورت اور جامع تعریف کی میرے لیے وہ بہت کچھ ہے اور اس نے میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔

''حصہ شعر و شاعری'' بنت مجتبیٰ مینا کے کلام سے دو خوبصورت منتخب اشعار:

دیکھنے والا نہ ہو تو حسن میں کچھ بھی نہیں
حسن کیا ہے ایک عالم، عشق کیا ہے اک نظر

یہ طلوع مہران تاریکیوں سے کیا کہوں
شام کی کاجل بھری آنکھوں کا آنسو ہے سحر

حبیب الرحمٰن صاحب کی غزل سے حاصل غزل خوبصورت شعر۔ قدیم اساتذہ کا رنگ:

منہ دیکھتے رہ جائیں گے، کیا قیس کیا مجنوں
گر میں نے اڑا دی، ذرا دامن پہ جمی دھول

نجمہ یاسمین یوسف صاحبہ نے اس بار الہ آبادی (انڈیا) زبان میں غزل کہی ہے۔

کیوں اوڑھ کے سر سے پیر خزاں، ہم سیر چمن کو آ نکلے
ہر کانٹا گھاؤ لگاوت ہے، ہر غنچہ آنکھ دکھاوت ہے

اس غزل میں بھی قدیم اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔

''پناہ مانگو'' احمد حاطب صدیقی کی دل کو چھوتی آزاد شاعری میں نظم:

حرم کے سجدہ گزارو
اپنی خفیف پیشانیاں زمین حرم پہ رکھ دو
لرزتے ہونٹوں، بلکتے دل سے خدائے غفار کو پکارو

رابعہ شبیر احمد کی بھی چھوٹے بحر میں خوبصورت آزاد نظم:

یہی دعا ہے کہ مجھ پہ تو اپنے نور کی
بے شمار کرنیں اُتار پروردگار
یہ دل پنہ طلب ہے

عزیزہ انجم صاحبہ کی تازہ صورتحال کا اظہار کرتی غزل:

اب محبت کا اظہار ممکن نہیں
خود کو سمجھائیے، موت کا خوف ہے
گھومتی پھر رہی ہے بلا ہر طرف
گھر سے مت جائیے موت کا خوف ہے

''قرنطینہ'' وبا کے پس منظر میں لکھی ہوئی نیّر کاشف کی خوبصورت کہانی۔ بزرگوں کے جذبات اور دل کا احوال خوب بیان کیا ہے کہ وہ تو ہر لمحہ اپنی اولاد کی رونق کو ترستے رہتے ہیں اور یہ موقع انہیں جب کبھی ملتا ہے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ کاش بچے بزرگوں کے جذبات واحساسات کا ہمیشہ خیال رکھیں، یوں وہ جنت کما سکتے ہیں۔

''پہلے نمبر پر'' (قانتہ رابعہ صاحبہ) آپ نے اس کہانی میں یہ

نکتہ بڑے پیار اور نرمی سے سمجھایا ہے کہ ہمیں اللہ کی رضا کو ہمیشہ اول نمبر پہ رکھنا چاہیے۔ اس طرح ہمارے سارے کام خود بخود سیدھے ہو جائیں گے۔

''کبھی بھول نہ پائیں گے'' (عالیہ حمید) دو نوجوانوں کی ایمانداری کا قصہ جو ڈیڑھ لاکھ کی خطیر رقم اصل مالک کو واپس کر دیتے ہیں حالانکہ وہ انہیں سڑک پر پڑی ہوئی ملتی ہے۔ کاش ہمارے وطن کے سب لوگ ایسے ہی دیانتدار ہو جائیں تو ہمارا ملک ایک عظیم ملک بن جائے۔

''سلسلے'' (ہادیہ امین) آپ نے خوب سمجھایا ہے کہ ہمارے ہاں پرانی خاندانی روایات بہت اچھی تھیں جب جائنٹ فیملی سسٹم تھا، سب خاندان والے اکٹھے رہتے تھے۔ الگ الگ گھر بسانے کی خواہش نے تو ان خوبصورت روایات کو روند کے رکھ دیا ہے۔ محبتیں اور برکتیں اٹھ گئی ہیں۔ خودغرضی نے ڈیرے جما لیے ہیں۔

''پانچویں بیٹی'' (صبیحہ نبوت صاحبہ) معاشرتی تناظر میں یہ اہم نکتہ ہے کہ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں ان کے دم سے گھر میں رونق، چہل پہل ہوتی ہے۔ ان کے دلوں میں ماں باپ اور سبھی خاندان والوں سے محبت کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

''خوف کی سیڑھی پر آخری قدم'' (قانتہ رابعہ صاحبہ) کرونا سے پیدا ہونے والے المیوں اور پریشانیوں کو آشکارا کرتی ایک المیہ داستان کہ اس موذی وبا نے کتنے ہی ہنستے بستے گھر اجاڑ دیے ہیں۔ ایسی زبردست کہانی قانتہ رابعہ صاحبہ ہی لکھ سکتی ہیں۔

''چہل قدمی'' (ام ایمان) یہ کہانی ہمیں یہ پیارا پیغام دیتی ہے کہ:

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

واقعی ضرورت مندوں کے کام آنا ہی زندگی کا اصل حسن ہے۔

''ہوشیار'' (فرحی نعیم) گھریلو رشتوں میں گندھی ایک خوبصورت کہانی۔ سسرال میں پیار محبت، سلوک اور سلیقے سے سب کا دل جیتا جا سکتا ہے۔ اچھے جملے لکھے ہیں ''یہ رشتے صرف محبت سے بنتے ہیں، یہ ہمیشہ خار کی طرح نہیں چبھتے، بلکہ پھولوں کی طرح نرم اور خوشبو دار بھی ہوتے ہیں''۔

''فصلِ گل کی نمود'' مدیحۃ الرحمٰن کی لکھی ہوئی جذبات میں گندھی کہانی۔ فاطمہ نے اپنے سٹوڈنٹس میں جذبہ شہادت پیدا کیا اور ایک دن اس کا ایک سٹوڈنٹ کیپٹن بن گیا اور محاذ پر لڑتے ہوئے شہید ہو کر ہمیشہ کی زندگی پا گیا۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے بے اختیار آنکھیں نم ہوئیں۔

''نشیب و فراز'' (حبیب الرحمٰن) ایک سسپنس اور تجسس سے بھرپور کہانی جس اجنبی کو شادی کا پیغام دینا چاہا وہ سگی بہن نکلی۔ حبیب الرحمٰن صاحب اچھے شاعر تو ہیں ہی لیکن آپ کو کہانی لکھنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ شروع سے آخر تک سسپنس قائم رہتا ہے۔

''ماضی کے دریچوں سے'' (آمنہ راحت) سفرنامے کا آغاز دلچسپ ہے۔ ابھی تو استنبول پہنچے ہیں۔ صرف ایک مقام ''نیلی مسجد'' دیکھنے گئے ہیں۔ امید ہے یہ سفرنامہ خاصا دلچسپ رہے گا۔

''روزہ اور انسانی صحت'' (ڈاکٹر مقبول احمد شاہد) اس مضمون میں روزہ رکھنے کے روحانی فوائد کے ساتھ ساتھ طبی فوائد بھی خوب گنوائے گئے ہیں جیسے معدہ کی اصلاح، دل کے امراض میں افاقہ وغیرہ۔ سوال و جواب کے ذریعہ روزہ کے مسائل بہت اچھی طرح سمجھائے گئے ہیں۔

''ہمیں کون سے حقوق چاہئیں'' (ڈاکٹر فلزہ آفاق) حقوق نسواں پر ایک مختصر لیکن بہترین مضمون۔ بتایا گیا ہے کہ عورت کو اس کا اعلیٰ اور ارفع مقام ہمارے مذہب اسلام نے ہی دیا ہے۔ مضمون میں یہ جملے خصوصی توجہ کے طالب ہیں ''اُسے تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ عزت و احترام دیا جائے، جب وہ رخصت ہو کر شوہر کے گھر جائے تو وہاں بھی اسی پیار اور قدر سے اس کا استقبال کیا جائے اس کے نازک جذبات و احساسات کو سمجھا جائے''۔

''اوراب نور'' (فرزانہ کوثر) یہ مضمون ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ یہ ہمیں احساس دلاتا ہے کہ ہم اپنی منزل کو بھول چکے ہیں بے راہ

روی کا شکار ہیں ۔ اسی لیے تو زینب اور نور جیسی ننھی کلیوں کے ساتھ درندگی کے واقعات پیش آ رہے ہیں ۔ ایسے شیطان صفت لوگوں کو چوراہوں میں عبرت ناک سزائیں دینے کی ضرورت ہے ۔ کاش ہمارے جوان اور افراد با حیا اور باعمل مسلمان بن جائیں اور سنبھل جائیں تو ہمارا معاشرہ پھر جنت نظیر بن جائے۔

''ابو آپ بہت یاد آتے ہیں'' (نگہت پروین) یہ مضمون اپنے مرحوم والدین کی یاد میں لکھا گیا اور دل پہ اثر کرتا ہے۔ یہ جملے خاص طور پر قابل ذکر ہیں'' ماں باپ جیسی نعمتیں اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہیں ۔ ماں باپ دعاؤں کا خزانہ ہیں دلوں کا سکون ہیں رحمتوں کی بارشیں ہیں اور دکھ میں سائبان ہیں'' مصنفہ نے اپنے والد کی پیاری پیاری باتوں اور یادوں کو قارئین کے ساتھ شیئر کیا ہے۔

''حسن آوارگی'' (اسوہ بتول) سکول کے زمانے کی شرارتوں پہ لکھا ہؤا ایک بہترین ہلکے پھلکے مزاح سے سجا مضمون ۔ یہ بچپن اور طالب علمی کا سنہری دور پھر لوٹ کے نہیں آتا۔

''چمن بتول'' کے پھولوں اور پھلواریوں کی مہک سے مسحور ہوتے ہوتے اب آیئے گوشۂ تسنیم کی طرف (تسنیم جنت کی ایک نہر کا نام ہے)

گوشۂ تسنیم'' بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ'' (ڈاکٹر بشریٰ تسنیم صاحبہ) اس مختصر مضمون میں ڈاکٹر صاحبہ نے واضح کیا ہے کہ ہر مسلمان پر داعی الی اللہ ہونے کا فریضہ عائد ہوتا ہے اور یہ وہ اپنے اخلاق، عمل اور کردار و گفتار کے ذریعہ کر سکتا ہے لیکن یہ ضروری فریضہ ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

''پہچان'' بشریٰ صاحبہ کا دوسرا ایمان افروز مضمون ہے ۔ اس میں ڈاکٹر صاحبہ کی مدبرانہ اور تعمیری سوچ انسان کو یہ سوچنے پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنی اصل کو پہچانے اور وہ بن جائے جس مقصد کے لیے اسے اس کرہ ارض پر خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے خوب لکھا ہے'' دنیا میں اپنی پہچان کے دو ہی راستے ہیں حق اور باطل ۔ جس نے حق کا راستہ اختیار کیا وہ سعادت و فلاح پا گیا'' اس مضمون میں ہم ڈاکٹر صاحبہ کے دل کی وہ تڑپ محسوس کر سکتے ہیں جو ان کے دل میں قوم کی اصلاح کے لیے موجود ہے۔

آخر میں ایک دفعہ پھر مجلس ادارت (محترمہ ثریا اسما صاحبہ، محترمہ صائمہ اسما اور محترمہ آسیہ راشد) اور ''چمن بتول'' کے تمام سٹاف کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ اس مشکل دور میں بھی انہوں نے اپنی انتھک محنت اور تگ و دو سے ''چمن بتول'' کی آبیاری کی۔ اسے بنایا سنوارا ایک حسین گلدستہ بنا کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا اور ہم سب کے دل جیت لیے۔ اللہ ان سب کو اس کا اجر دے (آمین) سب کے لیے نیک تمنائیں۔

☆.....☆.....☆

فریدہ خالد۔ بلوچستان

جب سے وطن واپسی ہوئی ہے ۔ اسی سوچ میں ہوں کہ بتول میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں مگر ساڑھے تین سال کی غیر حاضری مجھے بہت مہنگی پڑ رہی ہے دراصل ''ان پیج'' کو ڈاؤن لوڈ کرنے کا مسئلہ ہے اور پھر اس صحرا میں دور تک کوئی پوسٹ آفس نہیں ہے کہ میں لکھ کر پوسٹ کر سکوں۔ بتول بھی مجھ تک تین ماہ تک پہنچتا ہے ۔ کراچی کے پتے پر تو وقت پر ہی آ جاتا ہوگا لیکن جب کبھی میاں صاحب یا ان کے کسی دوست کا کراچی جانا ہوتا ہے تو ہی بتول لیا جا سکتا ہے۔ الف خ رعنا آنٹی کی وفات پر بھی میں سوچتی ہی رہی مگر لکھ نہ پائی ۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ۔ (آمین)

جنوری سے مارچ تک کے رسالوں پر مختصراً تبصرہ حاضر ہے مارچ کے آخری دنوں میں ملے اور اسی لیے پڑھتے ہی لکھنے بیٹھ گئی ہوں ویسے تو ٹائٹل جنوری اور فروری کے بھی خوبصورت اور جاذب نظر ہیں لیکن مجھے تو مارچ کے رسالے کا کنول کے پھولوں سے سجا ٹائٹل بہت پسند آیا ہے۔ پروفیسر امینہ سراج نے اخلاق کی اہمیت پر بڑا جامع مضمون لکھا ہے۔ دونوں حصوں کے مضامین پڑھ کر خیال آتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمیں اپنے اخلاق سنوارنے کی کس قدر تاکید کی ہے۔

لیکن ہم بحیثیت قوم اس میں کس قدر پیچھے ہیں۔اگر چہ مغرب کی بہت سی باتوں کو میں ذاتی طور پر پسند نہیں کرتی اور نہ ہی بہت متاثر ہوتی ہوں۔ شاید اس لیے کہ مجھے ان کے درمیان رہنے اور اس معاشرے کے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔مگر میں ان میں سے اکثر کے اخلاق سے بہت متاثر ہوتی ہوں۔اور اس کی کئی مثالیں اس وقت بھی میرے ذہن میں موجود ہیں۔ہمیں ضرورت ہے کہ اپنے اخلاق کو بہترین بنانے کے لیے نہ صرف کوشش کریں بلکہ اللہ تعالیٰ سے بہت دعائیں بھی کریں۔

جنوری کے میگزین میں مجھے ڈاکٹر گوہر مشتاق صاحب کا مضمون ''زکوٰۃ اور صدقات کی حکمتیں'' بہترین لگا ہے۔ڈاکٹر صاحب بہت ہی اہم موضوع پر قرآن اور سائنس کی روشنی میں اتنے موثر انداز میں لکھتے ہیں کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔صرف یہی نہیں ان کے مضامین میں حوالہ جات کی وجہ سے جب ہمیں دوسروں کو یہی بات سمجھانی پڑتی ہے تو بڑی آسانی ہوتی ہے۔یعنی پڑھنے والا ان کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے لگتا ہے۔بس ان سے ایک شکایت ہے کہ وہ بہت کم لکھتے ہیں میری گزارش ہے کہ وہ ہر ماہ ایک مضمون لکھیں۔

اس کے علاوہ باقی تمام مضامین بھی بہت اچھے انداز میں لکھے گئے ہیں لیکن ''کامیاب تجارت'' میں بشریٰ تسنیم صاحبہ نے جو گُر سکھائے ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم ان پر عمل کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابیاں سمیٹیں۔عموماً میں غزلیں یا نظمیں نہیں پڑھتی لیکن شاہدہ سحر کی ''رخصتی'' کو پورا پڑھے بغیر نہ رہ سکی دنیا سے رخصتی کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔

فروری کے شمارے میں مودودیؒ صاحب کا مضمون ''ایک صدی پہلے'' پڑھ کر احساس ہوا کہ ملکوں کی آزادی صرف چند ایک رہنماؤں کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ایسے رہنماؤں کی مرہون منت ہوتی ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں تک زندہ رہتے ہیں۔'' یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے'' فرحت طاہر کا ایک دلچسپ اور مزاح سے بھرپور مضمون جو سوچ کے کئی در وا کر گیا ہے۔''نوزی والے بابا'' جویریہ ندیم نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں ضرورت مندوں کو محتاجی سے نکال کر اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا گُر بتایا ہے۔کاش ہمارا معاشرہ اس قسم کی باتوں اور کاموں پر توجہ دے اور ہم میں سے جس سے بھی اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکتا ہے ضرور کرے۔شاید اس طرح بھیک مانگنے والوں کا کاروبار تو ختم نہ ہو مگر کچھ بھکاری ضرور ختم ہو جائیں گے۔خاص طور پر ایسے خوددار لوگ جو کسی سے کچھ مانگنا پسند ہی نہیں کرتے اور یہ ہم میں سے ہر ایک کی ذمہ داری ہے۔

مارچ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح بہترین ہے۔صائمہ اسما صاحبہ نہ صرف حالات حاضرہ پر چند الفاظ میں بہترین انداز میں لکھتی ہیں بلکہ مہینے بھر کے کئی مسائل میں سے اہم ترین مسائل کا انتخاب کرتی ہیں اور ایسے سوالات اٹھاتی ہیں کہ ہر پڑھنے والا سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

☆.....☆.....☆

شہلا کرن، طاہرہ طلعت۔کراچی

دلکش ٹائٹل کے ساتھ اور نیلے اور پیلے رنگوں سے سجا بتول خوبصورت صبح کی طرح طلوع ہوا۔فروری 2020 کا یہ شمارہ اپنے حسب روایت معلوماتی اور نصیحت آموز مضامین سے بھرا ہوا تھا۔محترمہ صائمہ اسما کا اداریہ بہت سے قابل غور نکات سے بھرا ہوا تھا اور انہوں نے بہت حد تک حالات کا صحیح اور غیر جانبدار تجزیہ پیش کیا ہے اور سکے کے دونوں رخوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک اچھے تجزیے کی خصوصیت ہوتی ہے۔کرونا وائرس اس وقت ایک ایسی افتاد کے طور پر سامنے آیا ہے جو انسانیت کو درپیش ایک بڑا چیلنج بن گیا ہے اور اس کا دائرہ کئی ممالک تک پھیل چکا ہے۔اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں بہت سے قابل ڈاکٹرز ہیں۔مگر سرمایہ کم ہونے یا اس کا صحیح استعمال نہ ہونے کی وجہ سے صحت کا شعبہ دگرگوں حالات میں ہے۔جبکہ جدید دور کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیں اور زیادہ منظّم ہو کر جدید سہولتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔یہ بھی ٹھیک ہے کہ موجودہ حکومت ڈیڑھ سال کا عرصہ پورا کر چکی ہے۔انہوں نے دعوے تو بہت بڑے کیے تھے اور بہت جلد عوام کے لیے خوشخبریوں کا اعلان بھی کیا تھا مگر آہستہ آہستہ تمام دعوے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے ہیں

۔خاص طور پر عام لوگوں کے مسائل جوں کے توں ہیں بلکہ پہلے سے بھی بڑھ گئے ہیں۔نجانے وہ کونسا دن ہوگا جب اس ملک میں واقعی تبدیلی نظر آئے گی اور صرف باتوں کی حد تک نہیں بلکہ عمل کی۔

''ایمان مفصل'' ایک سچی کہانی تھی جو محترمہ عالیہ حمید نے پیش کی ہے۔انہوں نے اس پہلو پر قلم اٹھایا ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے وقت ہمیں پیروں فقیروں کے پاس جانے کی بجائے صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے تو اس کا نتیجہ بھی ملتا ہے۔جیسے ان کے پڑوسی نے کیا اور آخر کار اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھ لیا اور کئی لوگوں کا تجربہ ہے کہ مصیبت کے وقت کتنے بھی تعویذ گنڈے کر لیں وہ کامیاب نہیں ہوتے اور خدا سے رابطہ صحیح معنوں میں استوار کرنا ضروری ہوتا ہے۔مگر ہم یہ بھی کہنا چاہیں گے کہ بیشک عام طور پر زیادہ تر پیر فقیر وغیرہ جاہل اور ان پڑھ ہوتے ہیں اور وہ لوگوں کے کمزور اعتقاد کا فائدہ اٹھا کر لوگوں سے خوب مال بٹورتے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ زندگی اور موت اور ہر چیز کا مالک بالآخر خدا ہی ہے۔ لیکن یہ بات سمجھنا بھی ضروری ہے کہ اللہ ہی نے کچھ ذریعے بھی بنائے ہیں جیسے پودا اللہ کی مرضی سے اُگتا ہے اور اسی کی مرضی سے رزق بھی دیتا ہے۔لیکن پھر بھی مالی کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اللہ کسی شخص کو بھیجتا ضرور ہے جو اس چیز کے ظاہری طور پر وقوع پذیر ہونے کا باعث بنتا ہے۔خدا کے کچھ برگزیدہ بندے ایسے بھی ہیں جو اسی کے نام سے شفا وغیرہ دینے کا سبب بنتے ہیں اور ان کی دعاؤں میں تاثیر ہوتی ہے۔اور اس کا غلط فائدہ بھی نہیں اٹھاتے۔

محترمہ نصرت یوسف صاحبہ نے اس مرتبہ بھی ایک اچھا افسانہ تخلیق کیا ہے۔ویسے آپ کے رسالے میں شائع ہونے والے ان کے افسانے کم اور مختصر ناول زیادہ کہے جا سکتے ہیں۔ان کا خیال بالکل ٹھیک ہے کہ زندگی سمجھوتوں سے بھرپور ہوتی ہے اور انسان شروع سے آخر تک سہاروں پر ہی جیتا ہے۔اس لیے قرآن پاک کی ایک آیت جس کا محترمہ نصرت یوسف صاحبہ نے حوالہ دیا ہے میں انسان کو اس کی حقیقت یاد دلائی گئی ہے تاکہ وہ تکبر نہ کرے اور پھر ہر انسان کسی نہ کسی انداز میں محتاج ہے۔مگر جو لوگ دوسروں کو حقیر جانتے ہیں اور ان پر احسان جتاتے ہیں اللہ انہیں بھی ایک دن ان کی حقیقت دکھا دے گا۔اس پہلو کو بھی اُجاگر کرنا چاہیے۔''محبت تم اور میں'' مدیحہ مدثر صاحبہ کی تحریر تھی۔اس میں شوہر اور بیوی کی باہمی رنجشوں اور اس کے بعد ان کا ایک دوسرے کی قدر پہچاننا اور خصوصاً شوہر کو بیوی کی قدر کا احساس ہونا کہ وہ بھی تمام مشکلات میں اس کی شریک ہوتی ہے بہت اچھا لگا۔یہ ایک بہت عام مسئلہ ہے جس کو انہوں نے خوبصورت زبان اور انداز میں پیش کیا ہے۔ خصوصاً آخری ڈائیلاگ بہت اثر انگیز ہیں۔دانش یار صاحب کی ''دل کی لگی'' ایک بہت اچھی کہانی تھی اور غالباً کسی سچے واقعے پر مبنی تھی۔اس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ جو مرد ایک سے زیادہ شادیاں اور معاشقے کرتے پھرتے ہیں ان کی ذاتی زندگی انتشار کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ چیزیں رفتہ رفتہ انہیں کہیں کا نہیں چھوڑتیں کیونکہ گھر انسان کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی جگہ ہوتا ہے۔اگر گھر میں ہی استحکام نہ ہو تو پورے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔مصنف نے ایک بہت بڑی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔'' دشت تنہائی میں'' ڈاکٹر میمونہ حمزہ کی کہانی بھی تقریباً اسی موضوع پر تھی جس میں ایک عورت کا ذکر کیا گیا ہے۔جس کا شوہر دوسری شادی کر لیتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ گھر اور بچوں کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دیتا ہے اور خود ہر چیز سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مردوں کی دوسری تیسری شادیاں کرنے کی وجہ سے ان کے بچوں اور خاندان پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔شاہدہ ناز قاضی صاحبہ کے ناول کی آخری قسط بہت دلچسپ تھی اور اس کا موضوع بھی یہی تھا۔یہ ایک ایسے غیر مخلص شخص کی کہانی تھی جو صرف دولت کے حصول اور ہوس کے لیے مختلف عورتوں سے شادی کا ڈھونگ رچاتا رہا۔مگر پھر اس کا منطقی انجام بھی دکھایا گیا ہے کہ آخر میں وہ تنہا رہ جاتا ہے۔اور یہی اس کی سزا ہونی بھی چاہیے۔''نہاں خانہ دل'' بھی ایک اچھی تحریر تھی۔

''دل کا دروازہ کھلا رکھنا'' ایک جسمانی صحت کے متعلق مضمون تھا کہ دل کو کس طرح صحت مند رکھا جا سکتا ہے۔اس تحریر کا نام پسند آیا۔ میمونہ عبدالرحمٰن صاحبہ نے اپنی تحریر ''ہماری زبان'' میں مادری زبان اردو کی اہمیت پر زور دیا۔اور یہ بتایا کہ انگریزی غیروں کی زبان ہے اور ہمیں

اپنی ہی زبان کو استعمال کرنا چاہیے۔ اردو کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے کیونکہ جو کچھ بھی انسان سیکھتا ہے وہ بالآخر اپنی مادری زبان میں ہی سیکھتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ انگریزی اب صرف انگریزوں کی زبان نہیں رہی بلکہ ایک بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔ خاص طور پر موبائل، کمپیوٹر وغیرہ میں ہم اس کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ احساس سر سید احمد خان نے بھی ایک صدی پہلے ہمیں دلایا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بہر حال نہیں ہے کہ ہم اپنی ثقافت اور تشخص کو بھول جائیں۔ ہمیں دونوں زبانوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ اسی طرح ''خوش اخلاقی'' بھی ایک نازک معاشرتی مسئلے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ''بائیں ہاتھ کا کھیل'' بہت اچھی مزاحیہ تحریر تھی۔ ''محشر خیال'' میں پروفیسر خواجہ مسعود کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ غزلیں اور نظمیں بھی سب اچھی تھیں۔ محترمہ نجمہ یاسمین یوسف کا یہ شعر

؎ میری نظروں میں اُجالا سوز داغ شوق سے
رفتہ رفتہ بن گیا ہے تابش غم روشنی

کافی پر اثر شعر ہے۔ اس میں بہت خوبصورتی سے غم اور امید کی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں یہ کہیں گے کہ ''بتول'' ایک معیاری رسالہ ہے جس کی زبان بہت اچھی ہوتی ہے اور یہ اردو ادب کی آبیاری کر رہا ہے۔ مگر ایک گزارش ہے کہ اس کی تحریروں کو روایتی عشق و محبت کے موضوعات سے نکال کر کچھ فلسفیانہ اور تصوفانہ رنگ میں بھی ڈھالا جائے۔ آخر میں یہ دعا ہے کہ خدا اس کو مزید رفعتیں عطا کرے اور اس کے قدم مضبوطی سے آگے بڑھتے جائیں۔ خلوص کے ساتھ۔

☆.....☆.....☆

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''پانچ حالتوں کو دوسری پانچ حالتوں کے آنے سے پہلے غنیمت جانو اور اُن سے جو فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو وہ اٹھالو!

غنیمت جانو جوانی کو بڑھاپے کے آنے سے پہلے۔

غنیمت جانو تندرستی کو بیمار ہونے سے پہلے۔

غنیمت جانو خوشحالی اور فراخ دستی کو ناداری اور تنگدستی سے پہلے۔

غنیمت جانو فرصت اور فراغت کو مشغولیت سے پہلے۔

اور غنیمت جانو زندگی کو موت سے پہلے۔

(بحوالہ: شمع ہدایت، از ظفر اللہ خان)

ٹپ ٹاپ ڈرائی کلینرز

گوشہ تسنیم

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

کرونا کے دن!

دن رات اور موسموں کی طرح انسان کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔عقل والے ہر قسم کے حالات میں اپنا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ ان کا مقام ومرتبہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا بھی یہی منشا ہوتا ہے کہ اچھے برے حالات کے ذریعے وہ اپنے بندوں کی جانچ پرکھ کرتا رہے کہ اس کے بندے اپنے رب کے ساتھ کیا رویہ رکھتے ہیں۔

''اور ہم اچھے برے حالات میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کرتے رہیں گے اور ہماری طرف ہی تم سب نے پلٹ کر آنا ہے'' (الانبیاء۔35)''اور ہم نے ضرور آزمانا ہے خوف، بھوک، اموال اور جانوں اور ثمرات کے نقصان میں مبتلا کر کے اور خوشخبری تو صبر کرنے والوں کے لیے ہے'' (البقرہ)۔

مومن کو ہر حال میں اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ رب العلمین اس سے راضی رہے۔خوشحالی ہو یا بدحالی وہ رب سے قربت کا متمنی رہتا ہے۔اسے اس بات کی فکر رہتی ہے کہ رب ناراض نہ ہوجائے۔ہم آج کل جن حالات سے دوچار ہیں ان میں ہمارا طرز عمل ہی بتائے گا کہ ہم اپنے رب سے کیا تعلق رکھتے ہیں یا ہم اپنے رب کی نظر میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ساری دنیا ایک وبائی موسم میں وقت گزار رہی ہے۔یہ وقت ساری دنیا پہ ایک جیسی آزمائش بن کر آیا ہے مگر یہ وقت ہر فرد کے اپنے عقیدے، نظریے ایمان علم اور عقل وشعور کے مطابق نتیجہ خیز ہوگا۔ان حالات میں جب سارے ضروری غیر ضروری اخراجات، مشاغل، بند ہیں۔ہم کس نہج پہ سوچتے ہیں؟ گزرے وقت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جو وقت گزر رہا ہے یہ گذشتہ گزرے وقت سے بہتر ہو رہا ہے یا اس سے برا ہو رہا ہے؟ گزری عمر کی خرافات پہ ندامت ہے یا فرصت کے اس وقت کو غنیمت جان کر پہلے سے زیادہ وقت برباد کیا جا رہا ہے؟

آخرت کی فکر کرنے والے اور رب سے محبت اور قرب کی تلاش کرنے والے مومن کو غور کرنا چاہئے۔چند نکات یہ ہیں:

- جب بندے کو گناہ برے لگیں اور وہ گناہوں کی طرف لوٹنے کو ناپسند کرے تو سمجھ لے کہ یہ وقت خیر اور نیک اعمال کی قبولیت کی علامت ہے، اور موجودہ آزمائش اسے رب سے قریب کر رہی ہے۔اور جب انسان اپنے گناہ یاد کر کے غمزدہ، نادم اور حسرت زدہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی توبہ اور عبادت قبول کر لی گئی ہے۔اسے پہلے سے بہتر کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔
- رب سے قربت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ بندے کا اور زیادہ عبادت، نیکیاں کرنے میں دل لگتا ہے اور نیکیوں میں تیزی اور جوش وجذبہ بڑھ جاتا ہے۔حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں: نیکی کی جزا ایک نیکی کے بعد دوسری نیکی اور برائی کی سزا ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرنا ہے۔نیکیوں کے کام کو مسلسل کرتے رہنا اور ان پر ثبات انسان کے لیے خاتمہ بالخیر کا سبب بن جاتا ہے اور پھر اسے اسی حالت میں موت آتی ہے۔جو اطاعت الٰہی پر زندگی بسر کرے تو اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی یہ گوارا نہیں کرتی کہ اس کو برے خاتمے یا نافرمانی پر موت آئے۔اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کی سنت ہے کہ جو جس حالت پر زندگی گزارتا ہے اسی حالت پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔جو جس حالت پر مرتا ہے اسی حالت پر اسے قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔
- مومن نیکیوں پر مضبوطی سے جمے رہنے اور تقرب الٰہی کے اعمال کرتے رہنے کے باوجود اپنے دل میں بہت زیادہ ڈرتا رہتا ہے، کہیں وہ قبولیت سے محروم نہ کر دیا جائے، یہ فکر بھی قربت الٰہی کا موجب بنتی ہے۔عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا ''وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَة'' وہ لوگ جو اللہ کے راستے میں جو کچھ بھی دیتے ہیں جبکہ ان کے

دل ڈر رہے ہوتے ہیں'' کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب نوشی کرتے ہیں اور چوریاں کرتے ہیں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اے صدیقؓ کی بیٹی،، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں نجانے یہ اعمال ان سے قبول کیے جائیں گے یا نہیں، تو یہی لوگ نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں۔

فرصت کے ان لمحات میں نیکی کی طرف رغبت اور ان پہ ثابت قدمی، گناہوں پہ استغفار کی کثرت ہے تو یہ رب کی خصوصی نظر عنایت ہے۔ لہٰذا قرب الٰہی کی علامات میں سے ہے کہ مخلص اپنے اعمال کو حقیر جانتے ہیں، ان کو کچھ نہیں سمجھتے نہ ان کا پرچار کرتے ہیں نہ ہی مغرور ہوتے ہیں وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کا اجر ضائع نہ ہو جائے۔ ان کا اپنے اعمال کو حقیر جاننا دراصل معرفت الٰہی اور ربانی نعمتوں کا ادراک اور اپنے گناہ اور کوتاہیوں کو یاد کرنے کی بنا پر ہوتا ہے۔

- اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس بندے کا مقام بلند ہے جس کا دل آخرت کے ساتھ معلق ہو جاتا ہے، وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونے اور اپنے اعمال کی جوابدہی کو یاد رکھتا ہے۔ جواباً اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد رکھتا ہے۔ (**فاذکرونی اذکرکم**) اور اسے گناہوں سے دور رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ آخرت میں عذاب سے ڈرتا ہے اس لیے صغیرہ کبیرہ گناہوں پر اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت کی علامت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندے کے دل میں صالحین کو محبوب اور نافرمانوں کو ناپسندیدہ بنا دیتے ہیں۔ بندے کا اپنے تمام اعمال اللہ کے لیے خالص کر لینا اپنے خلوص میں شہرت اور ریاکاری کی ملاوٹ نہ کرنا، اپنے عمل میں مخلوق میں سے کسی کو شریک اور حصہ دار ہرگز نہ بنانا، دراصل اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بن جانا ہے۔ اپنی جان کو اور گھر والوں کی جانوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر آج کی سب سے بڑی فکرعقلمندی کی دلیل ہے ورنہ سب احمق ہیں۔

ان امتحان کے دنوں میں انسان کا برائیوں پر برقرار رہنا اور حرام کاموں کی طرف رغبت رکھنا اور شرعی واجبات فرض نمازوں وغیرہ کو چھوڑ دینا یا اپنی من مرضی کے مطابق شریعت کی پابندی کرنا، اعمال صالحہ میں پہلے کی طرح ہی سستی دکھانا اس بات کا مظہر ہے کہ بندہ وہ مخلوق ہے جس کو نہیں پتہ چلتا کہ مالک نے اسے کیوں باندھ دیا کیوں چھوڑ دیا۔ ایسا بندہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو رہا ہے اور رب نے دوستی کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا مگر اس نے اسے جھٹک دیا ہے ۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**۔

تو غور کرنے کا مقام ہے کہ گھر میں فرصت کا وقت کیسا گزر رہا ہے۔ صرف کھانا پینا، سونا، ٹی وی پہ فلمیں ڈرامے دیکھنا، موبائل کا بے جا استعمال نفسانی خواہشات کا غلبہ ہے۔ رب کے سامنے کھڑے ہونے سے بے فکری بڑھ گئی ہے تو اپنے رب سے دعا کی جائے کہ وہ ''دل بدل دے'' ۔ اگر فرائض میں زیادہ یکسوئی، قرآن پاک کی تلاوت میں اضافہ، اپنا محاسبہ کرتے ہوئے استغفار، بہتر سے بہترین اعمال صالح کی لگن، انفاق فی سبیل اللہ میں کشادہ دلی، گھر والوں کی اخروی کامیابی کی لگن کے ساتھ باہمی تعلقات میں نرمی آ گئی ہے، مستقبل میں رجوع الی اللہ پہ ثابت قدمی کا عزم ہے تو پھر مبارک ہو اللہ تعالیٰ سے قرب کی راہ ہموار ہو رہی ہے، گناہوں سے معافی مل رہی ہے گویا رب راضی ہو کر جنت کی بشارت دے رہا ہے۔

☆☆☆